صلیبیں مرے دریچے میں

فیض احمد فیض

مغربی بنگال اردو اکاڈمی

صلیبیں مرے دریچے میں

فیض احمد فیض

ناشر

مغربی بنگال اردو اکاڈمی
۱۷ سندری موہن ایونیو - کلکتہ ۷۰۰۰۱۴

جملہ حقوق بحق محفوظ

مغربی بنگال اردو اکاڈمی

۱۷ سندری موہن ایونیو۔ کلکتہ ۱۴

سالِ اشاعت ________ ۱۹۸۲ء

تعداد اشاعت ________ ایک ہزار

خوشنویس ________ نذیر احمد، جگتدل

مطبوعہ کوہِ نور آرٹ پریس ۳ عبد العلی روڈ، کلکتہ ۱۶…۷

قیمت ________ ۱۶ روپئے

نقطۂ نظر

"مکتوب نگاری ایک فن ہے" جیسا کہ پروفیسر خورشید الاسلام نے کہا کہ "زندگی بسر کرنا بھی ایک فن ہے"۔ یوں دیکھئے تو زندگی بسر کرنے کی متنوع کیفیات مکاتیب کی بساط پر نقش و نگار قائم کرتی چلی جاتی ہیں اور مکاتیب کے حوالے سے مکتوب نگار کے شخصی تجربات، محسوسات، خیالات اور ان سے کہیں زیادہ عصری میلانات کی شناخت قائم ہوتی ہے۔ فیض احمد فیضؔ نے بھی زنداں کی سلاخوں کے پیچھے سے خطوط لکھے۔ اگر غالبؔ کے خطوط سے انیسویں صدی کی دِلّی کی تہذیبی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے تو فیضؔ کے خطوط میں بھی بیسویں صدی کی زندگی اپنی جھلکیاں دکھاتی ہیں۔

خطوط کا یہ مجموعہ "صلیبیں مرے دریچے میں" کے عنوان سے بہت پہلے شائع ہوا تھا لیکن یہ کتاب کمیاب ہو گئی ہے۔ فیضؔ صاحب اپریل ۱۹۸۰ء میں افرو۔ ایشین کانفرنس میں شرکت کرنے کلکتہ آئے تھے اور اس مبارک موقع پر مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے اُن کیلئے ایک عوامی استقبالیہ کا اہتمام کیا تھا۔ اُن کی آمد سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم نے ان کی کتاب شائع کرنے کی اجازت چاہی تھی اور فیضؔ صاحب نے اجازت دیکر بڑے خلوص کا مظاہرہ کیا تھا۔ ان کا تحریری اجازت نامہ بھی عکسی حالت میں شائع کیا جا رہا ہے۔

محمد فخرالدین
سکریٹری
مغربی بنگال اردو اکاڈمی

پیش لفظ

خطوط سبھی لکھتے ہیں۔ میں نے لکھے۔ آپ نے لکھے ۔ غالبؔ، ابوالکلام آزادؔ اور فیض احمد فیضؔ نے بھی لکھے!

فیضؔ اپنے مجموعۂ خطوط ۔ "صلیبیں مرے دریچے میں" یوں رقم طراز ہیں:۔

"ظاہر ہے یہ کوئی ادبی تصنیف نہیں ہے۔ نجی خطوط ہیں جو قلم برداشتہ لکھے گئے ہوں۔ کسی مربوط اور سنجیدہ بحث کی تلاش بیکار ہے۔ صرف اتنا ہے کہ جیل خانے میں دفع الوقتی کے بہت محدود ذرائع میں سے ایک ذریعہ خط و کتابت بھی ہے۔ اس لئے کوئی حکایت لذیذ ہو یا نہ ہو خواہ مخواہ دراز کرنے کو جی چاہتا ہے —"

حکایت کو خواہ مخواہ دراز کرنے کا معاملہ اگر نہ ہوتا تو نہ اردو ادب کو "غبارِ خاطر" جیسا بے بہا تحفہ ملتا نہ "اردوئے معلّٰی" کی وہ تحریریں ملتیں جس نے اردو نثر نویسی کی نہ صرف راہیں بلکہ منزلیں تک بدل ڈالیں اور نہ "صلیبیں مرے دریچے میں"۔ قاری کو اس عزمِ نہاں اور غمِ پوشیدہ کا احساس دلاتیں جن سے فیضؔ کے خطوط مملو ہیں۔ اپنی شریکِ حیات ایلسؔ کے نام فیضؔ نے اپنے ایامِ اسیری میں یہ خط انگریزی

میں لکھے تھے۔ مرزا ظفرالحسن صاحب "سر پر سوار ہو گئے" اور خود فیض سے ان خطوط کا ترجمہ اُردو میں کروا لیا۔ اُردو ادب کو ایک بیش قیمت تصنیف مل گئی!

ان خطوط میں ہمیں زبان و ادب کی وہ تمام لطافتیں ملتی ہیں جن سے اُردو زبان عبارت ہے۔ فیض ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۵ء تک پاکستان میں مسلسل حراست میں رہے۔ طویل قید و بند کی سختیاں جھیلیں۔ مایوسیوں اور محرومیوں سے سابقہ پڑا۔ کتنے ہی خواب ٹوٹے اور بکھر گئے لیکن فیض کی نوک قلم پر۔ اُف۔ کا لفظ نہیں آیا۔ ایک محبّت کرنے والا شوہر، شاعر اور فنکار، اپنی محبت کرنے والی شریک زندگی کو نجی خطوط لکھتا ہے۔ نہ مایوسیوں کا ماتم ہے نہ محرومیوں کا غم! یہ خطوط ایک مرد مجاہد کے عزم و استقلال، صبر و انتظار کی تصویر و تلقین ہیں۔ خطوط کی بے باک، رواں دواں اور شگفتہ عبارت میں مزاح اعلےٰ اور طنز لطیف کی وہ جھلکیاں بھی ملتی ہیں جو اُن غموں کی غماز ہیں جو فیض کے دل میں دَورِ حراست میں پروان چڑھتے رہے۔

جیل کی تنہائیاں، احساس بیچارگی و محرومی کے باوجود، ایک ایسی یکسوئی عطا کر دیتی ہیں جس میں ایک دردمند شاعر کے لئے پرواز خیال کی وسعتیں بھی ملتی ہیں اور حادثات و حقائق کو بکھیرنے، چھانٹنے، تولنے اور سمیٹنے کی بصیرت بھی حاصل ہوتی ہے۔ فیض نے اپنے قید و بند کے زمانے میں جو شاعری کی وہ اپنی جگہ آسماں گیر سہی لیکن حادثات و حقائق کی جو بخیہ شکنی و بخیہ گری اُن کے خطوط کے لطیف پیرائے میں ملتی ہیں وہ مثالی حیثیت کی حامل ہیں۔ فیض کا شعر ہے:-

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے وہ گزری
تنہا پس زنداں کبھی رسوا سرِ بازار

فیض کے خطوط خود اپنے شعر کی تفسیر ہیں۔

سالکؔ لکھنوی

Chief - Editor

P.O.B. 135/430
BEIRUT - LEBANON
Tel : 800011 - 800211

LOTUS

Jornal of Afro - Asian
Writers Association
(English - French - Arabic)

Date ____________

Ref. ____________

The West Bengal Urdu Academy Calcutta are hereby entitled to publish my prose works (میزان، متاعِ لوح و قلم، پاکستان کی قومی ثقافت، صلیبیں مرے دریچے میں) at their convenience.

28/4/1980

Faiz Ahmed Faiz

فیض سامعین سے خطاب کرتے ہوئے۔

فیض، اراکین اکاڈمی اور مہمانوں کے ساتھ۔

فہرس

گزارشِ احوالِ واقعی ______ ۱۳

کتاب اور صاحبِ کتاب کی کہانی ______ ۱۵

حیدر آباد جیل سے لکھے ہوئے خطوط ______ ۲۵

کراچی سے لکھے ہوئے خطوط ______ ۱۷۱

منٹگمری جیل سے لکھے ہوئے خطوط ______ ۱۸۱

چھیمی اور میزی کے نام خطوط ______ ۲۲۲

گزارشِ احوالِ واقعی

اس کتاب میں جو خطوط شامل ہیں وہ تو میں نے ہی لکھے تھے لیکن یہ کتاب نہ میں نے لکھی ہے نہ چھپوائی ہے۔ اسے لکھوانے اور چھپوانے کے واحد ذمہ دار ادارۂ یادگارِ غالبؔ والے مرزا ظفر الحسن ہیں۔

اب سے چند ماہ پہلے مرزا صاحب نے تقاضا شروع کیا کہ میں اپنی سرگزشت یا تجرباتِ زندگی وغیرہ کے بارے میں کچھ لکھوں، وہ اصرار کرتے رہے اور میں ٹالتا رہا آخر پیچھا چھڑانے کی خاطر میں نے یہ خطوط بیوی سے لیکر ان کے حوالے کئے کہ اِن میں کانٹ چھانٹ خود ہی کر لیجئے۔ اس کے بجائے وہ نہ صرف ان خطوط کی اشاعت کے درپے ہو گئے بلکہ اِن کے ترجمے پر بھی مجھ ہی کو مامور کر دیا۔ بات یہیں تک رہتی تو مضائقہ نہ تھا اس لئے کہ ہمیں کام چوری کے بہت سے گُر یاد ہیں لیکن یہ حضرت کاغذ قلم سنبھال سر پر سوار ہو گئے کہ آپ ترجمہ لکھوایئے میں لکھتا ہوں۔ نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ کوئی ادبی تصنیف نہیں ہے۔ نجی خطوط ہیں، جو قلم برداشتہ لکھے گئے ہوں۔ کسی مربوط اور سنجیدہ بحث کی تلاش بے کار ہے، صرف اتنا ہے کہ جیل خانے میں دفع الوقتی کے بہت ہی محدود ذرائع میں سے ایک ذریعہ خط و کتابت بھی ہے اس لئے کوئی حکایت لذیذ ہو یا نہ ہو اسے خواہ مخواہ دراز کرنے کو جی چاہتا ہے، موسم کی بات ہو، کسی کتاب کا تذکرہ ہو یا داخلی محسوسات کا بیان ہو۔ لیکن یہ سب قصّے تفصیلی فکر و تجزیئے کے بغیر بیشتر سطحی سے انداز میں لکھے جاتے ہیں جن سے لکھنے والے کی افتادِ طبع کے بارے میں شاید کچھ واقفیت حاصل ہو سکے لیکن اِن موضوعات کے بارے میں

زیادہ بصیرت بہم نہیں پہنچ سکتی۔

اس کے علاوہ ایسے خطوط میں تسلسل کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن ٹیپ کے مصرعے کی طرح کچھ باتیں بار بار دہرائی جاتی ہیں۔ کتابی صورت میں یہ تکرار شاید اچھی نہ لگے۔ اور سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ یہ خطوط اُردو میں نہیں انگریزی میں لکھے گئے تھے۔ ایک زبان کے مُنفرد الفاظ کا ترجمہ کچھ ایسا مشکل کام نہیں اور مفہوم کی ادائیگی میں بھی کوئی خاص دقّت پیش نہیں آتی لیکن انگریزی کا روزمرّہ کا لہجہ اور ہے اُردو کا اور۔ ہر زبان کی طرح انگریزی کے روزمرّہ محاورے، تلمیحات، ضرب الامثال کہاوتیں وغیرہ وغیرہ۔ اسی زبان سے مخصوص ہیں اور بہت سی محنت اور تلاش کے بغیر انہیں اُردو میں منتقل کرنا محال ہے لیکن مرزا ظفر الحسن نے محنت اور تلاش کی مہلت ہی کب دی ہے۔ جیسے قلم برداشتہ یہ خطوط لکھے گئے تھے ویسے ہی "منہ زبانی" ان کا ترجمہ کیا گیا ہے اور زبان و بیان کی ان کوتاہیوں کی ذمّہ داری بھی مرزا صاحب ہی کے سر پر ہے۔

مجھے اِن خطوط کی اشاعت کا ایک ہی جواز نظر آتا ہے اور وہ یہ کہ چونکہ ہمارے ہاں بہت سے لوگوں کے لئے قید و بند کوئی غیر متوقع سانحہ یا حادثہ نہیں بلکہ معمولاتِ زندگی میں داخل ہے اس لئے بہت ممکن ہے کہ ہمارے شعبۂ عمرانیات میں "حبسیات" بجائے خود ایک موضوعِ تحقیق ٹھہرے، اس صورت میں شاید خطوط طویل اسیری کے نفسیاتی تجربے کا ایک آدھ پہلو اُجاگر کر سکیں۔

فیض احمد فیض

کتاب اور صاحبِ کتاب کی کہانی

"جناب فیض احمد فیضؔ کو فیضؔ صاحب لکھنا مجھے اتنا ہی ناگوار معلوم ہوتا ہے جتنا کہ غالبؔ کو غالبؔ صاحب یا اقبالؔ کو اقبالؔ صاحب کہنا۔ بلکہ مجھے تو یہ ان کے لئے بدگوئی اور اپنے لئے بدذوقی محسوس ہوتی ہے اس لئے میں فیضؔ ہی لکھوں گا جس میں احترام بھی ہے اور پیار بھی۔

اوپر کی تحریر فیضؔ کی سوانح حیات "عمرِ گزشتہ کی کتاب" کی ابتدائی سطریں ہیں جو میں آج کل لکھ رہا ہوں اور جسے میں اپنے لئے ایک اعزاز سمجھتا ہوں۔ فیضؔ کی ہر تخلیق چاہے وہ شعر ہو' نثر یا نجی مکتوبات کی صورت میں' بلاشبہ ادب کا بیش بہا سرمایہ ہے۔ اس لئے میرا خیال تھا کہ ایلس فیضؔ کے نام لکھے ہوئے خطوط جو ایک طرف فیضؔ کے فکر و نظر کے نقش ہائے رنگ رنگ ہیں اور دوسری طرف خود ان کے خط (۲) کے مطابق "پرائیویٹ نہیں پبلک" ہیں کتابی صورت میں ضرور شائع ہوں۔

یہی خیال آج سے اٹھارہ سال پہلے ایلس نے ظاہر کیا تو فیضؔ نے اپنے خط (۷۹) میں جواب دیا تھا "کاش ایسے قصوں کا فیصلہ کرنے کے لئے اے۔ ایس۔ بی (پطرس بخاری) یہاں ہوتے۔ بہرصورت اگر انہیں چھپوانے کا فیصلہ کرو تو یہ اردو میں چھپنے چاہئیں۔" چنانچہ ایلس نے فیصلہ کیا کہ خطوط چھپیں اور اردو ہی میں چھپیں تاکہ حق دار کو حق مل جائے یعنی شعری تخلیقات کی طرح نثری تخلیقات بھی ادب کے قبضے میں آجائیں۔ البتہ یہ شرکتِ ایلس۔ "بہ شرکتِ ایلس" کی تفصیل یہ ہے۔

اپنی جان سے زیادہ عزیز اور قیمتی سمجھ کر ان خطوط کو بیس سال تک حفاظت کے ساتھ رکھنا اور اب ان کی اشاعت کی اجازت دینا ایلس فیض کا ایک احسان ہے کسی فرد یا ادارے پر نہیں بلکہ ادب پر۔ نہ صرف خط محفوظ رکھے بلکہ ہمیشہ ضرورت مند مدیروں کو جب بھی انہوں نے مانگا، ان کی نقلیں ٹائپ کر کے دیں۔ خط ملتے ہی اُن پر تاریخ لکھ دی۔ فیض خط پر اکثر صرف دن ہی لکھا کرتے تھے اور جو کبھی کبھار تاریخ درج کی بھی ہے تو مہینہ ندارد۔ قسم لے لیجئے جو کبھی سال لکھا ہو۔ بعض خطوں پر تو نہ دن لکھا ہے نہ تاریخ اور نہ سال۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ بعض اوقات تو سنسر والے بھی فیض کی تقلید میں دن تاریخ گول کر گئے۔ صحبتِ سنسر نے فیض میں "سنسر" کی صلاحیت پیدا نہ کی یہ فیض کا پہلا کمال اور صحبتِ فیض نے سنسر کو صالح بنا دیا یہ فیض کا دوسرا کمال تھا۔ ایسے خطوط پر اگر وصول ہوتے ہی ایلس پابندی کے ساتھ تاریخ نہ لکھتیں تو بیس سال گزر جانے کے بعد آج اور آج کے بعد آنے والے برسوں میں اس سے کیسی اُلجھن ہوتی اس کا اندازہ لگانا کوئی مشکل بات نہیں۔ خطوط کی اشاعت میں ایلس نے اس لئے کوئی غیر معمولی دلچسپی نہیں لی کہ وہ اِن کے نام لکھے گئے ہیں یا اِن کے شوہر کے لکھے ہوئے ہیں بلکہ وہ دل سے یہ محسوس کرتی تھیں کہ شاعر کی یہ تحریریں بھی ادب کی جان ہیں۔

خطوط کا مجموعہ "صلیبیں مرے دریچے میں" کس طرح وجود میں آیا اِسے میں فیض کی سوانح کا جزو سمجھتا ہوں۔ اس لئے اس کا ریکارڈ رکھنا ضروری ہے۔ فیض کی ساٹھویں سالگرہ (ہفتہ ۱۳ فروری ۱۹۷۱ء) کے دوسرے دن فیض کی خود نوشت سوانح عمری (مجوّزہ) کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ ہم تینوں یعنی فیض، ایلس فیض اور میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ان خطوط کا ذکر چھڑا جو فیض نے ایلس کو اپنی اسیری کے زمانے میں لکھے تھے۔ ایلس خطوط کا ایک پلندہ لے آئیں جو بیس سال تک انہوں نے بڑی حفاظت سے سنبھال رکھا تھا۔ فیض نے مجھ سے کہا "تم یہ خط گھر لے جاؤ، انہیں غور سے پڑھو، اس کے بعد کوئی بات کریں گے"۔

خط اتنے دلچسپ اور فکر انگیز تھے کہ میں نے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالے دوسرے دن میں نے رائے دی کہ انہیں شائع ہو جانا چاہئے اور بہت جلد۔ یعنی مارچ ۱۹۷۱ء میں کیونکہ اب سے بیس سال پہلے مارچ ہی میں فیض گرفتار کئے گئے تھے (۹ مارچ ۱۹۵۱ء) البتہ میرا دل کہہ رہا تھا کہ اگلا ہی مہینہ مارچ ہے۔ نہ اتنی جلدی خطوط کا ترجمہ ہو سکے گا اور نہ کوئی ایک کاتب ان تمام خطوط کی کتابت کر سکے گا اس لئے اپنے طور پر سوچ لیا کہ مجموعہ جون ۱۹۷۱ء میں شائع ہو سکتا ہے۔ اُس وقت بھی بیس سال کی شرط پوری ہو گی کیونکہ پہلا خط جون میں لکھا گیا تھا (جون ۱۹۵۱ء) خود نوشت سوانح عمری کا قصہ پس منظر میں چلا گیا۔ فیض کہنے لگے "پہلے اس مجموعے سے نپٹ لیں اس کے بعد خود نوشت سوانح کے متعلق غور کریں گے کہ کیا ہو سکتا ہے"۔ ایلس نے الگ سے مجھ سے کہا فیض کی نیت نیک نہیں معلوم ہوتی نہ جانے خود نوشت کب شروع ہو۔ تم نے جو فیض کی سوانح عمری کا منصوبہ بنایا ہے اس پر کام کرتے رہو۔ البتہ ۔۔ فیض کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ۔۔ خطوط کے ترجمے کے سلسلے میں اس شخص پر کبھی رحم نہ کھانا۔

لگے ہاتھوں بے رحمی کی بات بھی کر لیں۔ میں ذاتی طور پر یہ محسوس کرتا ہوں کہ فیض کی شخصیت کا سب سے بڑا جوہر اُن کی شرافت ہے۔ شرافتِ نفس، شرافتِ ذہن اور شرافتِ زبان۔ میں اوروں کے مقابلے میں یہ بات زیادہ اعتماد کے ساتھ اس لئے کہہ سکتا ہوں کہ خوش قسمتی سے مجھے فیض کا قرب حاصل ہے اور شاعر نہ سہی "شخص" کچھ حد تک میری دسترس میں ہے۔ اپنے متعلق بات کرتے ہوئے فیض کو سخت اُلجھن ہوتی ہے۔ مجھے بھی ہوتی ہے مگر اس سے کم فیض اپنی بات کرتے ہوئے کیوں کتراتے ہیں۔ نہ جانے اپنا نفس کس کونے کھدرے میں چھپا کر رکھ دیا ہے۔ اور ذہن تو وہ آئینے کی طرح شفاف ہے۔ شرافتِ نفس اور شرافتِ ذہن کی مثالیں آپ کو خود ان کے خطوط میں جا بجا ملیں گی۔ مزید تفصیل کے لئے فیض کی سوانح کا انتظار کیجئے۔

شرافتِ زبان دیکھئے کہ آج تک "پاجی" سے زیادہ برا لفظ فیض کی زبان

سے نہیں سنا گیا۔ اپنے خط (۷۹) میں ایلس کو مشورہ دیتے ہیں "لوگوں کے بارے میں کچھ زیادہ فصیح اسمائے صفت کا استعمال اگر تم کم کر دو تو اچھا ہے۔ ان سے خفگی اور برہمی سمجھ میں تو آتی ہے لیکن اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا" زبان کے تعلق سے فیض نے جو اشارہ کیا ہے اس پر وہ خود بڑی سختی سے عمل کرتے ہیں۔ شاعر کے ساتھ بے رحمی کا برتاؤ تو وہ ہمارے مشاعرے باز حضرات کرتے ہی رہتے ہیں۔ لندن میں ہوں یا ماسکو میں لاہور گئے ہوں یا ڈھاکہ آپ ہر مشاعرے کے اعلان میں فیض کا نام ضرور پائیں گے ٹیلی فون کر دیا کہ کل رات مشاعرہ ہے ضرور آیئے۔ مشاعرہ شروع ہونے کے بعد خود آدھمکے کہ جلدی چلئے محفل آپ کے انتظار میں ہے وغیرہ۔ یہ تو ہوا شاعر کا حشر۔ رہا ایلس والے "شخص" پر رحم نہ کھانے کا مسئلہ یعنی طبیعت موزوں ہو یا نہ ہو فیض سے یہ جبر خطوط کا ترجمہ کرانا یہ تو میری سکت کے باہر اور خود میری مرضی کے خلاف بات تھی اس لئے ایلس کے اصرار کے باوصف جب بھی فیض مجھ سے کہتے کہ آج چھٹی کرو تو میں ان ہی کے الفاظ میں کہتا "ٹھیک ہے" حالانکہ مجھے یہ اعتماد تھا کہ اگر میں اصرار کرتا تو وہ اپنی شرافت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ترجمہ کرنے بیٹھ جاتے۔ چونکہ ایلس بنیادی طور پر سے استانی ہیں اس لئے فیض کو دیئے ہوئے "ہوم ورک" پر کڑی نظر رکھتی تھیں۔ اچھی استانی بے رحم نہیں ہوتی اور ایلس تو اچھی استانی ہی نہیں اچھی رفیقِ حیات بھی ہیں۔

مجموعے کے سلسلے میں طریقۂ کار یہ رہا کہ فیض پہلے پورا خط پڑھ لیتے، اس کے بعد اس کا ترجمہ مجھے لکھواتے، میں اسی رات بیٹھ کر وہ ترجمہ صاف خط میں لکھ دیتا، دوسرے دن فیض اس پر نظرِ ثانی کرتے، نظرِ ثانی کے بعد وہ ترجمہ ٹائپسٹ کو دیدیا جاتا، ٹائپ ہو جانے کے بعد فیض اس پر آخری نظر ڈالتے اور پھر وہ کاتب کے پاس بھیج دیا جاتا۔ کتابت شدہ خطوط آجاتے تو سحر انصاری پروف کی تصحیح کرتے۔ اس طرح ترجمے، نقل نویسی، ٹائپ، کتابت اور پروف ریڈنگ کے پانچ محاذوں پر پابندی اور تیزی کے ساتھ کام شروع ہو گیا۔

فروری سے مئی تک کی مدت میں فیض کو چار مرتبہ لاہور جانا پڑا جس سے بیس پچیس دن ضائع ہو گئے۔ پھر مختلف کالجوں کی تقریبات شروع ہو گئیں۔ کبھی سر سید گرلز کالج کی لڑکیاں انہیں پکڑے گئیں، کبھی گرامر اسکول کی طالبات ان کے گھر دھرنا دیکر بیٹھ گئیں کہ فیض صاحب آپ کو ہمارے اسکول چلنا ہی پڑے گا' یوم اقبال بھی ہوا' امتیاز علی تاج اور نیاز فتح پوری کی برسی بھی' عبداللہ ہارون کالج کے فرائض' ادارۂ یادگارِ غالب کی مصروفیات' مشاعرے' عشائیے' عصرانے' ظہرانے' حاجت مندوں کی مدد کے لئے دوڑ دھوپ' صبح' دوپہر شام کے ملاقاتیوں کی ریل پیل' ایک ہفتے تک ایلس کی علالت تین چار مرتبہ سخت گرمی کی لہر کا آنا' چند ایک میری غیر حاضریاں' غرض ان تمام آفات کے باوجود فیض اپنے محاذ پر ڈٹے رہے یا یوں سمجھئے کہ ایلس نے ان پر پہرہ بٹھا رکھا تھا۔ ایلس میں مقناطیس کی کوئی خاصیت ضرور ہے کیونکہ خود میں بھی دو ایک دن کے لئے چاہتا تو بھی کام سے جی نہ چرا سکتا تھا۔ ہر غیر حاضری پر ایلس مجھ سے کہتیں "کل تم بہت یاد آئے۔"

کام کی رفتار حوصلہ شکن ہی رہی ہے۔ جس طرح دھوبی سے کپڑوں کا حساب لیتے ہیں اسی طرح ہر تیسرے چوتھے روز ایلس پوچھ لیتیں آج کتنے خط ہوئے' ابھی کتنے باقی ہیں اور میں ان سے جوا باً کہتا مجموعہ جون میں ضرور شائع ہوگا۔ البتہ دل ہی دل میں ڈرتا تھا کہ اگر ایسا نہ ہوا تو؟

ایک دن میں نے ذرا دبے لفظوں میں کہا وقت کم اور کام زیادہ ہے اس لئے ترجمے کی رفتار تیز کرنے کی ضرورت ہے۔ اس پر فیض کہنے لگے کہ سارے خطوط شائع کرنے کی کیا ضرورت ہے صرف سو خط چھاپو۔ میں نے جواب دیا خط تو ایک بھی کم نہ کریں البتہ ان میں جو غیر ضروری اور غیر اہم باتیں ہیں وہ حذف کر دیں تو ضخامت اور محنت کم ہو جائے گی۔ اس پر فیض نے کہا تو پھر تم تمام خطوط پڑھ کر حذف ہونے والے حصوں پر نشان لگا دو۔ ترجمہ کرتے وقت انہیں چھوڑ دیں گے۔ چنانچہ میں نے خطوط کے نسبتاً غیر اہم اور توضیح طلب حصوں پر سرخی سے نشان لگا دیئے۔

محققینِ فیضؔ، خاص مزاج رکھنے والے نقّاد اور عام قاری ضرور جاننا چاہیں گے کہ کس قسم کی باتیں حذف کی گئی ہیں۔ اس لئے یہ سب تفصیل سے بتا دینا ضروری ہے۔

تو صاحبو سُنو حذف شدہ حصّے کیا ہیں۔

۱ — القاب و آداب، خیر خیریت کی باتیں، دُعا سلام اور پیار، القاب و آداب کے سلسلے میں یہ بتا دوں کہ اصل خطوط انگریزی میں ہیں اس لئے ایلس کو ڈارلنگ، سویٹ ہارٹ، ڈیرسٹ، ڈیر وائف، بی لویڈ، مائی لو اور ڈیر لو سے مخاطب کیا ہے۔ اپنی بچیوں، چھیمی اور میزو کو Punny faces اور My pigeons لکھا ہے۔

بعض خطوط کی آخری سطر فرانسیسی زبان کا کوئی جملہ ہوتی تھی۔ معلوم نہیں سنسر والے اس کا مفہوم معلوم کر لیتے تھے یا اسے فیضؔ کی غلط انگریزی سمجھ کر ٹال جاتے تھے۔

۲ — معذرت۔ یعنی جواب دیر سے دیا، ایلس کی سالگرہ بھول گئے، اپنی شادی کی سالگرہ یاد نہ رہی وغیرہ۔ یوں تو فیضؔ نے معذرتیں تھوک کے بھاؤ کی ہیں مگر کہیں کہیں ان کے قلم سے کچھ اس قسم کی معذرت بھی نکل گئی ہے کہ میں نے پچھلے خط میں فلاں بات کا وعدہ کیا تھا مگر معذرت خواہ ہوں کہ پورا نہ کر سکا۔ اس معذرت کے حوالے سے پچھلے دو چار خط پڑھ ڈالیئے آپ کو فلاں بات کا وعدہ ملے گا ہی نہیں جس کے پورا نہ کرنے کی معذرت چاہی ہے۔ جب میں نے اس قسم کی معذرتوں کا ذکر کر کے بتایا کہ ایسے وعدوں کا کوئی حوالہ پچھلے خطوط میں نہیں ہے تو سُنی اَن سُنی کر دی۔ فیضؔ کو سُنی اَن سُنی کرنے کا ملکہ حاصل ہے۔ ملاحظہ ہو خط (۹۴)۔

اگر یہ غائب دماغی ہے تو ایک مزیدار بات سُنئے۔ ایک مرتبہ فیضؔ کا وہ خط جو چھیمی کے نام تھا لاہور پہنچ کر غلطی سے ایلس کے خط کے ساتھ منٹگمری جیل فیضؔ کے پاس لوٹ آیا۔ اس قصّے پر فیضؔ نے ایلس کو لکھا۔ "خوشی کی بات ہے کہ خاندان میں ہم ہی اکیلے غائب دماغ نہیں ہیں" (خط ۱۰۱)۔

۳ — اُن لوگوں کے تذکرے جن کے نام خطوط میں موجود ہیں مگر

واقعات کی تفصیل فیض کو یاد نہیں رہی۔

۴ ــــ مقدمے کی دفتری نوعیت کی باتیں۔

۵ ــــ روزمرّہ کی ضروریات کے لئے فرمائشیں کہ تولیہ ساتھ لاؤ۔ سوئٹر بھیج دو وغیرہ۔

۶ ــــ حساب کتاب اور بہت سے غیر اہم گھریلو معاملات والے حصّوں پر خطِ تنسیخ پھیرنا پڑا۔

۷ ــــ کچھ اور متفرق اور غیر اہم باتیں۔

خطوط کی ضخامت کم ہو جانے کے باوجود اپریل کے تیسرے ہفتے تک ترجمے کی رفتار تیز نہ ہو سکی تو میں نے ایلس کی موجودگی میں اس کا تذکرہ کیا۔ فیض کہنے لگے کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ بقیہ خطوط کا ترجمہ تم کر دو اور میں اِن پر نظرِ ثانی کر دوں؟ ایلس بھی دل سے چاہتی تھیں کہ کتاب جلد چھپ جائے۔ اس لئے انہوں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی اور کہا ظفر تم ترجمہ کر دو۔ میں نے معذرت چاہی اور کہا میں فیض کی طرح ترجمہ نہیں کر سکتا۔ مگر جب دونوں میاں بیوی نے بہت اصرار کیا تو میں نے تکمیلِ حجّت کے لئے حامی بھر لی کہ اچھا کوشش کرتا ہوں۔ نہ صرف ایمانداری کے ساتھ کوشش کی بلکہ توقع کے مطابق ناکام بھی ہوا جس کی مجھے یوں خوشی ہے کہ اگر چند ایک خطوط کے ترجمے پیش کر دیتا اور فیض انہیں خدانخواستہ منظور کر لیتے تو آپ کو مخمل میں ٹاٹ کا پیوند برداشت کرنا پڑتا۔ دو تین دِن بعد اپنی شکست کا اعلان کرتے ہوئے میں نے مثال دی کہ میں انگریزی محاورہ Kick up a row استعمال کر چکا ہوں اور خون خرابے کا مفہوم بھی جانتا ہوں مگر ترجمے کے وقت شاید میرا قلم خون خرابہ نہ لکھتا۔ اسی طرح Foot fall of the dawn کا ترجمہ "صبحِ فردا کی آوازِ پا" Good lord کا "لاحول ولاقوّۃ" اور Roger's Edge کا ترجمہ "پل صراط" صرف فیض کا حق ہے۔ اس کے علاوہ میں نے کہا یہ خطوط جس زبان کے طالب ہیں وہ زبان میں جانتا ضرور ہوں مگر لکھتا نہیں اور میرا اسلوبِ تحریر بالکل

مختلف ہے۔ جیسا کہ مجھے یقین تھا۔ فیضؔ نے سگریٹ کا کش چھوڑتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے۔"

ترجمہ نہ کرنے کی معذرت چاہنے اور اس کے قبول ہو جانے کے باوجود اتنا ضرور عرض کروں گا کہ مطبوعہ متن یا ترجمے میں میرا بھی تھوڑا بہت حصّہ ہے اور وہ اس طرح کہ فیضؔ جب مجھے ترجمہ لکھواتے تو پوری پابندی کے ساتھ جملے کے آخری الفاظ "ہے"، "ہوگا" وغیرہ بین السطور کی طرح "بین اللّب" چھوڑ دیتے تھے اور وہ چھوڑے ہوئے الفاظ میں لکھ لیا کرتا تھا۔ اس لئے ہر سطر کے آخر میں آپ کو "تھا"، تھی، تھے۔ گا، گے، گی۔ ہوتا، ہوتی، ہوتے" وغیرہ ملیں گے وہ سب کے سب میرے ہیں، فیضؔ کے نہیں ہیں۔ ہونٹ فیضؔ کے ہلتے قلم میرا چلتا اس لئے سمجھ لیجئے میں فیضؔ کا "پلے بیک سنگر" ہوں۔

اختصار کے ساتھ ہی سہی مگر ان خطوط میں موضوعات کا بے انتہا تنوع ملے گا۔ محبّت، پیار، حسن، زندگی، مطالعہ، شاعری، باغبانی، وقت، حرص، خود پسندی، خود فراموشی، خود بینی، شکایتیں، حکایتیں، کاہلی، کاروبار وغیرہ۔ ادیبوں اور ادب پاروں پر فیضؔ کا تبصرہ۔ مثال کے طور پر نینتشے ایک پاجی، آسکر وائلڈ ایک ادبی سارق۔ عجیب وغریب خبریں ملیں گی۔ مثلاً فیضؔ کی بلّی نے بچّے دیئے ہیں، شکرے کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ یا پندرہ آدمیوں کے لئے ڈیڑھ من حلوہ آیا تھا وغیرہ۔ عید اور کرسمس کی پارٹیاں، مشاعرے درسِ قرآن، درسِ غالبؔ، درسِ شیکسپیئر، ملاقاتیوں اور مدّاحوں کے خلوص کا ذکر، پرانی یادیں اور نئے ادبی منصوبے۔ موسم کا ذکر کیا تو لکھا گرمی بھنگ کا ایک تند وتیز پیالہ ہے۔ بارش کی بات کی تو لاہور اور دِلّی کو یاد کرنے لگے۔ زندگی کی جدوجہد میں بشاشت اور خوش طبعی کی ضرورت، دردِ جگر اور شکستِ دل کا مداوا، نیکوکار نظامِ حیات کی تشریح، جیل کی زندگی کی چھوٹی چھوٹی خود غرضیاں۔ کاہلی اور سہل انگاری کا جواز۔ غرض جتنے خط اس سے زیادہ باتیں۔ ہر بات نئی اور نکھری ہوئی۔

میں بطورِ خاص جن امور کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں ان میں فیضؔ کا فلسفہ، زندگی اور اس کے سفر کے متعلق فیضؔ کا تصور، خوش دِلی کے متعلق فیضؔ

کی رائے، ایلس سے فیض کی محبت اور ان کے لئے احسان مندی کے جذبات چھیمی اور میزی کو بڑا ہوتا ہوا دیکھ کر اور سُن کر ان کے متعلق فیض کے تاثرات ہیں ۔ یہ وہ باتیں ہیں جو فیض کے ذہن و زندگی پر پوری طرح نہ سہی مگر پہلی مرتبہ روشنی ڈال رہی ہیں ۔ فیض کی ادبی حیثیت پر لکھا جاتا رہا ہے مگر شخصیت پر بالکل نہیں لکھا گیا ہے ۔ اس لئے مجھے یقین ہے کہ شخصیت پر لکھنے والوں کے لئے یہ کتاب ایک اہم سنگ میل کا کام دے گی ۔ اگرچہ یہ مجموعہ کوئی ایسا تناور درخت نہیں ہے کہ فیض کی شخصیت کے تمام پہلو اس کے زیر سایہ مل جائیں ۔ پھر بھی میرا ایقان ہے کہ شخصیت کے وہ گل ہائے رنگ رنگ جو اب تک ہماری نظروں سے بالکل پوشیدہ تھے اسی سے کھلیں گے ، یہیں سے مہکیں گے ۔

فرنگی کی قید کے متعلق تو آپ جانتے ہیں ۔ وہی حسرت موہانی والی بات ہے ۔ مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی ۔ فرنگن کی قید کا حال مجھ سے سنئے ۔ یعنی فیض اور ایلس والی بات ۔ سمجھ لیجئے ایلس نے فیض سے کہا ہوگا ۔ چکی میں پیسوں گی مشقِ سخن تم کرو ۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ مئی کے پہلے اتوار اور اس کے بعد کے ہر اتوار کو ایلس نے فیض کو اور مجھے اپنے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں یہ پروگرام بتا کر بند کر دیا کہ ترجمہ شروع کرو ۔ گیارہ بجے کافی آئے گی ، ایک بجے کھانا ملے گا ، تین بجے چائے بھیجوں گی اور پانچ بجے تم لوگ اپنا کام ختم کر لو گے تو چائے کی ایک اور پیالی ۔ ہمیں خدا حافظ کہا اور ٹھنڈا کمرہ چھوڑ کر خود گرم کمرے میں چلی گئیں ــــ جاتے جاتے کہنے لگیں ۔ فیض تمہیں اپنے نئے مجموعے (سَرِ وادیٔ سینا) کے لئے کچھ نظمیں بھی تو لکھنی ہیں ۔ ایلس کے جانے کے بعد ترجمہ شروع ہوا ۔ کچھ دیر بعد فیض کہنے لگے ۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان خطوط کے متعلق پڑھنے والوں اور خریداروں کی کیا رائے ہو ۔ میں نے جواباً کہا مجھے یہ کتاب آپ کے کلام کے مجموعے کے مقابلے میں زیادہ اہم معلوم ہوتی ہے ۔ اس کے بعد ترجمہ لکھتے لکھتے مجھے مشتاق احمد خاں گرمانی کی دو صورتیں والی کہانی یاد آ گئی جو خط (۶۹) کے فٹ نوٹ میں درج ہے ۔ کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ اُمید وار کے فوج میں بھرتی ہونے سے جہنم میں جانے تک کے چھ مرحلوں میں سے ہر ایک مرحلے پر " دو صورتیں "

پیدا ہوتی ہیں ۔ نواب گرمانی کی بیان کردہ اِن دو صورتوں والی کہانی کی طرح آپ تصوّر کریں میں نے فیض سے کہا ہوگا کہ مجموعہ چھپ جانے کے بعد دو صورتیں ہوں گی۔ ایک صورت تو یہ کہ لوگ کتاب نہ خریدیں مگر کالے چور کی طرح چُرا کر پڑھیں۔ دوسری صورت یہ کہ خریدیں۔ اگر نہ خریدیں مگر چُرا کر پڑھیں تو ٹھیک ہے۔ اور اگر خریدیں تو دو صورتیں ہوں گی۔ ایک صورت یہ کہ کتاب نہ پڑھیں، اُسے اپنی الماری میں سجا کر رکھیں، لوگ مستعار مانگ کر لے جائیں اور کبھی واپس ہی نہ کریں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ پڑھیں۔ اگر نہ پڑھیں اور الماری میں سجا کر رکھیں تو ٹھیک ہے مستعار مانگ کر پڑھنے والوں کا بھلا ہوگا۔ اور اگر پڑھیں تو پھر دو صورتیں ہوں گی۔ ایک یہ کہ سمجھے بغیر نکتہ چینی کریں۔ دوسری صورت یہ کہ سمجھ کر تنقید کریں۔ بغیر سمجھے نکتہ چینی کریں تو ٹھیک ہے۔ کوئی سمجھدار آدمی اس نکتہ چینی کا جواب ہی نہ دے گا۔ اور اگر سمجھ کر تنقید کریں تو پھر دو صورتیں ہوں گی۔ ایک یہ کہ ناقد کا ذوق خراب ہے۔ دوسری صورت یہ کہ ناقد کا ذوق اچھا ہے مگر اس کے دل میں چور ہے۔ اگر ناقد کا ذوق بُرا ہے تو بُرا ہے کوئی کیا کر سکتا ہے۔ دوسری صورت میں ذوق اچھا ہے مگر اس کے دل میں چور ہے تو چور کے تعلق سے بھی دو صورتیں ہوں گی۔ ایک تو وہ کالا چور جو کتاب چُرا کر پڑھتا ہے اور دوسری صورت میں دل کا چور۔ پہلا چور تو ٹھیک ہے اس نے کتاب چُرا کر پڑھی ہے۔ دوسری صورت میں جو دل کا چور ہے تو وہ پہلے چور سے کچھ ایسا زیادہ بُرا تو نہیں۔ آخر اس نے بھی تو کتاب پڑھی ہے اس لئے اس کتاب کو ضرور چھپنا چاہئے۔

خریدنا، پڑھنا اور سمجھنا خریدار کا داخلی معاملہ ہے جس میں ہم مداخلت نہیں کر سکتے۔ اور کتاب فروخت کرنا پبلشر کا خارجی معاملہ ہے جس میں ہم اعانت نہیں کر سکتے۔

مرزا ظفر الحسن

جون ۱۹۷۱ء

حیدر آباد جیل

خط (۱) ۷ر جون ۱۹۵۱ء **تا** خط (۹۲) ۱۹ر جون ۱۹۵۳ء

خطوط کی تعداد بہ لحاظ ماہ و سال

مہینہ	۱۹۵۱ء	۱۹۵۲ء	۱۹۵۳ء	جملہ
جون	۳	۵	۲	۱۰
جولائی	۲	۴	×	۶
اگست	۴	۳	×	۷
ستمبر	۳	۲	×	۵
اکتوبر	۲	۵	×	۷
نومبر	۳	۶	×	۹
دسمبر	۲	۵	×	۷
جنوری	×	۳	۷	۱۰
فروری	×	۴	۲	۶
مارچ	×	۳	۶	۹
اپریل	×	۳	۳	۶
مئی	×	۵	۵	۱۰
جملہ	۱۹	۴۸	۲۵	۹۲

۱

۷/جون ۱۹۵۱ء

تمہیں پہلے نہیں لکھ سکا جس کا افسوس ہے لیکن یہاں ہر کام بہت دھیرے دھیرے ہوتا ہے اور خط لکھنے کے لئے کاغذ آج ہی ہاتھ آیا ہے۔ میں اور دوسرے ساتھی چار تاریخ کی صبح کو اسپیشل ٹرین سے یہاں پہنچے۔ ہم نے جس ٹھاٹھ سے سفر کیا دیکھنے کی چیز تھی۔ صرف بینڈ باجے کی کسر رہ گئی ورنہ جلوس اور تو سب کچھ تھا۔ گاڑی پہ سوار ہوتے ہی یوں محسوس ہوا کہ سب پریشانیاں دور ہو گئی ہیں۔ سفر کا لطف، دنیا کو دوبارہ دیکھنے کی لذت، پُرتکلّف کھانا، بہت سی نعمتیں یکبارہ ہاتھ آ گئیں، اُس دُور دراز دن کے بعد جب مجھے اچانک گھر سے لے گئے تھے پہلی بار مزے کا کھانا اس سفر کی دوپہر میں نصیب ہوا۔ بُھنا ہوا مُرغ، پلاؤ، فروٹ کاک ٹیل اور آئس کریم۔ (افسوس کہ بھوک نہیں لگ رہی تھی۔) اور اس پر اضافہ دُنیا کی سب سے عزیز چیز یعنی انسانوں کی صحبت جس سے اتنے دِن محروم رہے! اِن سب باتوں کی وجہ سے دل دوبارہ پُرسکون ہے، اب تمہیں بتانے میں کچھ ہرج نہیں کہ یہ تین چار دن جو لاہور میں گزرے، ایّامِ اسیری کے سب سے اذیّت ناک دِن تھے۔ جب مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ اپنے چاہنے والوں کو کسی ایسی چیز کی خاطر دُکھ اور اذیّت پہنچانا جو خود کو بہت عزیز ہو لیکن اُن کے لئے کچھ معنی نہ رکھتی ہو غلط اور ناجائز بات ہے۔ اِس نظر سے دیکھو تو آئیڈیل ازم یا اصول پرستی بھی خود غرضی کی ایک صورت بن جاتی ہے۔ اس لئے کہ اپنے کسی اُصول کی دُھن میں آپ یہ بھول جاتے ہیں کہ دوسروں کو کیا چیز عزیز ہے اور اس طرح اپنی خوشنودی کی خاطر دوسروں کا دِل دُکھاتے ہیں۔ اِس زمانے میں دل و دماغ پر اور بھی کئی باتوں کا انکشاف ہوا۔ اپنے بارے میں بھی، دوسروں کے بارے میں بھی۔ اپنے میں ایسی بہت سی کمزوریاں نظر آئیں جن کا وجود پہلے گمان میں نہ تھا۔ دوسروں میں کمینگی اور عالی حوصلگی کے ایسے پہلو دکھائی دیئے جو پہلے معلوم نہ تھے۔ اِس سارے تجربے کے لئے دِل احسان مند ہے۔ خیال ہے کہ جب یہاں سے نکلیں گے تو غالباً اپنی

شخصیت پہلے سے زیادہ مکمل اور منظم ہو گی۔ میں نے یہ بھی اچھی طرح محسوس کر لیا ہے کہ آدمی کیلئے مناسب یہی ہے کہ جو کچھ وہ ہے اُس پر قناعت کرے اور جو کچھ وہ نہیں ہے وہ کچھ بننے کی کوشش میں وقت اور محنت ضائع نہ کرے۔ اس طرح کی کوشش سے حماقت اور خود فریبی کے علاوہ کچھ حاصل نہیں۔

ہاں تو جیسے میں کہہ رہا تھا جب سے میں یہاں پہنچا ہوں خوف و خطر کا قطعی کوئی احساس دل میں باقی نہیں رہا۔ (اگرچہ یہ احساس پہلے بھی کچھ ایسا زیادہ نہ تھا، وہ اس وجہ سے کہ نہ صرف مجھ سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہیں ہوئی جسے اخلاقی طور سے گناہ کہہ سکیں بلکہ کوئی ایسا ارتکاب بھی نہیں کیا جسے رسمی یا قانونی طور سے جرم ٹھہرایا جا سکے) اب تو یوں ہے کہ اگر کوئی یاد نہ دلائے تو خیال بھی نہیں آتا کہ ہم جیل خانے میں ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ہم اپنی مرضی سے یہاں ہیں۔ اور اگر یہاں سے باہر جانے کو جی چاہے تو کوئی ہمیں روک بھی نہیں سکتا۔ جیل میں ہمارا گھر اچھا خاصا ہے۔ کھانے پینے کو کافی ملتا ہے۔ گرمی کچھ ایسی زیادہ نہیں۔ اسیری کے سب سے بُرے دن کٹ چکے ہیں اِس لئے کہ اب کچھ اور بھی ہو، نہ قیدِ تنہائی کا سامنا باقی ہے، نہ پولیس کی تکلیف دہ پوچھ گچھ کا ڈر ہے اور اپنی جان اور ناموس دونوں سلامت ہیں۔ اب تمہاری اور بچوں کی تصویریں سامنے رکھ کے میں خوشی سے مسکرا سکتا ہوں، تمہاری یاد سے پہلے کی طرح دل نہیں دُکھتا اور یہ یقین پہلے سے بھی زیادہ مُحکم ہو چلا ہے کہ زندگی خواہ کچھ بھی دکھائے بالآخر بہت خوب تیئے بھی ہے اور بہت حسین بھی۔

۲

۱۴ر جون ۱۹۵۱ء

اُمید ہے تمہیں میرا گزشتہ خط مل چکا ہو گا۔ اِن خطوط کو اتنے ہاتھوں سے گزرنا ہوتا ہے کہ اِن کے پہنچنے میں تاخیر یقینی ہے، اِس لئے اگر میرے خطوط کی رسید میں لمبا وقفہ آ جائے تو پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ تنہائی اور زباں بندی کے عالم میں بہت دِن گزارنے کے بعد آدمی اپنے بارے میں بہت زیادہ باتونی ہو جاتا ہے۔ (شاید میرا گزشتہ خط بھی ایسا ہی تھا) اس لئے جو خرافات میں لکھ بھیجوں اُس پر توجہ صرف کرنے کی ضرورت نہیں، مقصود صرف اس

خواہش کا اظہار ہے کہ بہت زمانے سے باتیں نہیں کیں اس لئے باتیں کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان خطوط کے ذریعہ ہماری بات چیت پرائیویٹ نہیں پبلک ہوتی ہے۔

گرفتاری کے بعد میں نے ابھی ابھی چھٹی نظم[1] ختم کی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ گزشتہ تین برس میں جتنا کچھ لکھا تھا۔ ان تین ماہ میں اس سے دوگنا لکھ چکا ہوں۔ لیکن اب یہ شاعرانہ کیفیت ختم ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ اس جگہ اتنا شور وغل، ہنسی مذاق اور خوش گپیاں رہتی ہیں کہ یکسوئی سے غور و فکر کرنا محال ہے، اس کے علاوہ اب ہم مقدمے کی تیاری میں مصروف ہیں اور فرصت کا وقت بہت کم ملتا ہے۔ بہرصورت اپنے گمشدہ جذبہ و احساس کا کچھ حصّہ میں نے دوبارہ برآمد کر لیا ہے اور یقین ہے کہ یہ قصّہ پاک ہو چکے تو دوبارہ باقاعدگی سے لکھ سکوں گا۔

موسم گرما ہو چلا ہے لیکن زیادہ تکلیف دہ نہیں ہے۔ لاہور میں تو آگ برس رہی ہوگی۔ بچّے اسے کیسا محسوس کرتے ہیں۔ اُن کی خیریت کا حال لکھو اور یہ بھی بتاؤ کہ تمہاری آمدنی اور اخراجات کی کوئی صورت بن گئی ہے یا نہیں۔ مجھے معلوم ہے تمہارا ہاتھ بہت تنگ ہوگا لیکن ہم نے اس سے زیادہ تنگ دستی کے دن بھی دیکھے ہیں اور جیسے وہ گزر گئے یہ بھی بیت جائیں گے۔

۳

۲۴ر جون ۱۹۵۱ء

۱۶ر تاریخ کا لکھا ہوا تمہارا پہلا خط ملا۔ بہت خوشی ہوئی، مجھے تعجب ہے کہ تمہیں میرا خط اب تک نہیں ملا۔ یہ خط نو یا دس تاریخ کو سنسر ہو جانا چاہئے تھا۔ جب بھی

---

[1] تمہارے حُسن کے نام (سلام لکھتا ہے شاعر تمہارے حسن کے نام) اس سے پہلے کی پانچ تخلیقات یہ تھیں (۱) روش روش ہے وہی انتظار کا موسم (۲) تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گزری ہے (۳) تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں (۴) شفق کی راکھ میں جل بجھ گیا ستارۂ شام (۵) قطعات، متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے۔ اک بار سوئے دامنِ یوسف تو دیکھئے۔

یہ خط ملے مجھے تاریخ سے مطلع کر دینا تاکہ ہم یہاں کسی سے خون خرابہ کر سکیں۔ انشورنس وغیرہ کے کاغذات تمہیں پندرہ تاریخ کو رجسٹری کر دیئے تھے اور اب تک پہنچ جانے چاہئیں۔

یہ سن کر اطمینان ہوا کہ تم اور بچے اچھی طرح ہو۔ اور اس مصیبت نے تم لوگوں کو دل برداشتہ نہیں کیا۔ مجھے تم لوگوں پر ناز کرنے کے لئے رہائی کے دن تک انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ناز تو مجھے اب بھی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جدائی کے دکھ کے علاوہ دل میں اور کسی پریشانی کا وجود نہیں۔ انسانی ذہن بھی عجیب چیز ہے۔ گزشتہ تین ماہ سے خیال ہر وقت اس مقدمے میں الجھا رہتا تھا لیکن اب جو مقدمہ شروع ہوا ہے تو اس کی کاروائی میں ذرا سی بھی دلچسپی محسوس نہیں ہوتی۔ میں بار بار دل کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں کہ معاملہ بہت سنگین ہے۔ اور اس کے بارے میں بہت سنجیدگی سے سوچنا چاہئے۔ لیکن دل پر کچھ اثر ہی نہیں ہوتا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بہت ہی مہمل اور بے حقیقت ناٹک کھیلا جا رہا ہے جو ایک دن ایسے ہی اچانک اور بے وجہ ختم ہو جائے گا جیسے کہ شروع ہوا تھا۔ میری گرفتاری اور اسیری کی طرح اس کا بھی نہ کوئی سبب ہے نہ جواز۔

ویسے میں بالکل صحت مند اور خوش ہوں البتہ پڑھنا لکھنا یا کام کرنا ذرا مشکل ہوتا جا رہا ہے اس لئے کہ ہمارے ساتھی ہر وقت ہنسی، مذاق اور غل غپاڑے سے آسمان سر پر اٹھائے رکھتے ہیں۔ جیسے میں نے شاید پہلے لکھا تھا یہاں بہت سے اچھے لطیفے سننے میں آئے جو کبھی ملیں گے تو سنائیں گے۔ لیکن ایک ہمارے مرکزی وزیر صاحب کا لطیفہ سن لو۔

حکایت ہے کہ کسی تقریب میں ہمارے کچھ مذہبی قسم کے ایک وزیر صاحب کے قریب ایک مسلمان لڑکی فراک پہنے بیٹھی تھی۔ وزیر صاحب نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے کسی صاحب سے کہا " دیکھو ہماری لڑکیاں ایسی بے حیا ہوتی جا رہی ہیں کہ اپنے اعضائے سہانی کا ستر ڈھانپنے کا بھی خیال نہیں کرتیں۔" ان صاحب نے کہا " یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں —— بے چاری نے گھٹنوں سے نیچے تک فراک پہن رکھی ہے" وزیر صاحب نے فرمایا —— "اس سے کیا ہوتا ہے مسلمان لڑکی کے اعضائے نہانی اس کے ٹخنوں تک پہنچتے ہیں۔" دوسرے لطیفے بد قسمتی سے ایسے خط میں نہیں لکھے جا سکتے جو بہت سے ہاتھوں سے گزرتا ہے۔

موسم اب گرم ہو چلا ہے لیکن ہوا چلتی رہتی ہے اس لئے کچھ ایسا ناخوشگوار بھی نہیں۔ البتہ اس کا رنج ہے کہ اب کے اپنے محبوب شہر لاہور کے بادل نظر نہیں آئیں گے اور نہ بارش کے بعد مہکتا اور مسکراتا ہوا سبزہ دکھائی دے گا۔ خیر۔ کبھی نہ کبھی۔

اماں[1] اور بھائی[2] طفیل کا پتہ بھیج دو تا کہ میں انہیں خط لکھ سکوں اور لندن میں اپنی اماں اور آبا[3] کا بھی۔ ہم لوگ مقررہ تعداد سے زیادہ خط نہیں لکھ سکتے لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے آنے والے خطوط پر کوئی پابندی نہیں بشرطیکہ اُن میں سیاسی معاملات وغیرہ کا ذکر نہ ہو اس لئے جملہ دوستوں کو اطلاع کر دو کہ جو بھی ہمیں لکھنا چاہے اُس کے خطوط کے لئے ہم بہ راہ نہ ہوں گے۔

ہمارا مقدمہ غالباً بہت دن چلے گا اس لئے میرا خیال ہے کہ تم لوگ جولائی کے اواخر تک آسکو تو آجاؤ۔ اس وقت تک موسم کچھ معتدل ہو جائے گا اور سفر زیادہ تکلیف دہ نہیں ہوگا۔ بہر صورت اپنی سہولت اور اپنی گرہ میں مال دیکھو۔ بے وجہ زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے یہاں کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ انسپکٹر جنرل قید خانہ جات لاہور کو ٹیلی فون کر کے پوچھ لو کہ شاہی قیدی کی حیثیت میں اگر ہمارے الاونس کا کچھ پیسہ بچا ہو تو تمہیں بھجوا دیں۔

۴

۲ر جولائی ۱۹۵۱ء

بہت دن انتظار کے بعد دو دن ہوئے تمہارا خط اور بچیوں[4] اور میزو[5] کے شاہکار وصول ہوئے۔ مجھے شبہ ہو چلا تھا کہ شاید میرے خطوط تمہیں نہیں پہنچے۔ یہ سُن کر خوشی ہوئی کہ تم خیریت سے ہو اور بہت قلیل تنخواہ میں کم از کم تمہاری دال روٹی چل رہی ہے غربت اور سختی کے دن ہم نے پہلے بھی بہت دیکھے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ جب ہم ساتھ تھے اور

---

[1] فیض کی والدہ [2] فیض کے بڑے بھائی طفیل احمد خان [3] مسٹر و مسز جارج [4] فیض کی بڑی لڑکی پورا نام سلیمہ سلطانہ۔ شادی کے بعد بیگم سلیمہ ہاشمی [5] چھوٹی لڑکی۔ پورا نام مُنیزہ گل۔ شادی کے بعد بیگم منیزہ ہاشمی۔

اَب یہ سارا بوجھ اکیلے تمہارے کندھوں پر ہے۔ خیر ہمیں اب بھی اتنا کچھ میسّر ہے کہ شکر ادا کرنا چاہئے۔ مثلاً مجھے تو اب سے پہلے کبھی ایسا سکونِ قلب میسّر نہیں ہوا۔ کم از کم اس طرح کا سکون جو اس وقت ہے اَب تو یوں لگتا ہے کہ جیسے دُنیا میں کسی سے کوئی شکایت ہی نہیں رہی بلکہ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے کہ یہ جیل خانہ ختم کرنے سے پہلے ہم کہیں ولی اللہ نہ بن جائیں۔ اس لئے کہ اَب کوئی بات، کوئی چیز بُری ہی نہیں لگتی۔ سارے جھوٹ، سارے فریب، وہ ساری تہمتیں جن پر پہلے دل کڑھا کرتا اَب یاد کرو تو صرف ہنسی آتی ہے اور ایک طرح سے دل خوش ہوتا ہے۔

جیسا کہ تم تصوّر کر سکتی ہو۔ لکھنے کی کوئی خاص خبر یا واقعہ یہاں ہمارے پاس ہے نہیں۔ سوائے اس کے کہ ہم سب لوگ خوش ہیں۔ مصروفیت کافی ہے اس لئے کہ عدالت اور وکیلوں سے صلاح مشورے میں کئی گھنٹے گزر جاتے ہیں، آج کل رات کو کھانے کے بعد میں اپنے ساتھیوں کو غالبؔ کی شاعری کا درس دیتا ہوں اور بہت لُطف آتا ہے۔ اپنی بڑائی کی بات نہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ میں بہت اچھا استاد ہوں اور مجھے مدرسی چھوڑ کر کبھی فوج میں نہیں جانا چاہئے تھا۔ اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ جب اس مقدمے وغیرہ کی بکواس ختم ہوگی تو صرف پڑھنے لکھنے کا کام کروں گا۔ فی الحال مجھے اور کتابیں درکار نہیں ہیں لیکن کچھ رسائل بھیج سکو تو اچھا ہے۔ عید کے لئے عدالت غالباً چار دن بند رہے گی اور نوازشؔ[1] صاحب تم سے ملنے آئیں گے۔ جو کچھ بھجوانا ہو اُن کے ہاتھ بھجوا دو۔ وہ بہت ہی اچھے آدمی ہیں اور مجھے بہت پسند ہیں۔ میں ہر روز اخبار میں موسم کا حال دیکھتا ہوں تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ تم لوگ کس حال میں ہو۔ لاہور میں تو اس وقت بہت خوفناک گرمی ہوگی۔ یہاں موسم ایسا بُرا نہیں ہے۔ ہماری مصیبت گرمی نہیں ریت اور آندھی ہے۔ بنّے[2] کو آخر کار اپنے گھر والوں کا ایک خط ملا ہے۔ سب لوگ خیریت سے ہیں۔

۵

۲۳ جولائی ۱۹۵۱ء

میں تمہارے خیریت سے گھر پہنچنے کی اطلاع کا منتظر ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ

---

[1] صاحبزادہ نوازش علی، جنہوں نے فیضؔ کی جانب سے وکالت کی۔ [2] سجّاد ظہیر

ہماری ملاقات اس قدر مختصر تھی لیکن آج کل ہر چھوٹی بڑی نعمت کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ بہرصورت تمہیں دیکھنے کے بعد دل پہلے سے زیادہ مطمئن ہے۔

تمہارے جانے کے بعد یہاں کا موسم یکایک بہت ہی ناخوشگوار ہو گیا تھا۔ گرمی اور حبس سے دم گھٹنے کی کیفیت تھی لیکن کل رات سے کچھ بہتر ہے۔ آج کہیں کہیں بادل کے ٹکڑے دکھائی دے رہے ہیں اور کم کم ہوا چل رہی ہے۔ یہاں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ بارش نہیں ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس ملک میں بارش خوبیٔ آب و ہوا ہی نہیں ہم لوگوں کی نفسیاتی ضرورت بھی ہے۔

آج کے اخبار میں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ امروز اور پاکستان ٹائمز کے دوست رہا کر دیئے گئے ہیں۔ میری طرف سے سب کو پیار پہنچا دینا۔

میں نے کتابوں کی جو فہرست بھیجی تھی اُس میں ایک عربی کتاب کا اضافہ کر دینا جو مجھے درکار ہے اور دستیاب ہو سکے تو باقی کتابوں کے ساتھ بھجوا دینا۔ کتاب کا نام ہے دیوان الحماسہ اور مُصنّف کا نام ہے ابو تمّام۔ اس کے علاوہ جتنے اُردو دیوان مل سکیں بھجوا دو۔ گھر میں بہت سے ہوں گے۔ نذیرؔ[1] یا کسی اور دوست سے کہو کہ انتخاب کر دیں۔

یہاں زندگی حسب معمول گزر رہی ہے اور کوئی خاص بات لکھنے کی نہیں۔ امّاں کا ایک خط آیا ہے جس پر کوئی پتہ درج نہیں اس لئے مہربانی سے ملفوفہ خط انہیں بھجوا دو۔

۶

۲ اگست ۱۹۵۱ء

یہ سُن کر بہت پریشانی ہوئی کہ تمہیں گھر خالی کرنے کا نوٹس دیا گیا ہے۔ . . . . سنسر نے کاٹ دیا . . . . ہو نہ ہو یہ محض کسی مسخرے کی حرکت ہے اور مجھے اُمید ہے کہ اب تک معاملہ سلجھ گیا ہو گا۔ میں نے اس سلسلے میں عدالت کو درخواست دی ہے اور اطلاع یہ ہے کہ عدالت والے حکومتِ پنجاب کو لکھ رہے ہیں۔ مجھے بے تابی سے یہ معلوم کرنے کا انتظار

---

[1] ڈاکٹر نذیر احمد سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج، لاہور

رہے گا کہ فیصلہ کیا ہوا۔ اگر گھر چھوڑنا ہی پڑا یا اس قسم کی حرکتیں جاری رہیں تو میرا مشورہ ہے کہ کسی مقامی مسلمان مالک مکان کا گھر کرائے پر لے لو۔ بہرصورت جیسے تم نے لکھا ہے یہ بھی اچھا ہے کہ ساری مصیبتیں ایک ہی بار روبرو آجائیں اور سب سے ایک ہی بار نپٹ لیا جائے۔ تمہیں اِس بارے میں کتنی پریشانی ہوگی میں جانتا ہوں اور تمہاری مشکلات کے خیال سے دل دکھتا ہے۔ لیکن صبر اور ہمت کے سوا کوئی چارہ نہیں اور مجھے معلوم ہے کہ تم میں اُن کی کمی نہیں۔

اب یہاں موسم خوشگوار ہے اور مجھے اُمید ہے کہ لاہور میں گرمی کے زیادہ برے دن گزر چکے ہوں گے۔ تمہارے آنے کا انتظار ہے۔ جب بھی سہولت ہو آجانا۔ آج کل ہم وزن کم کرنے کی فکر میں ہیں۔ اور شام کو ڈیک ٹینس قسم کا بہت تیز کھیل کھیلتے ہیں۔ مصروفیت بہت ہے اور خط لکھنے کا وقت صرف ہفتے کے آخر میں چھٹی کے دن ملتا ہے۔ یہ خط کچھ بے ہنگم سا ہے جس کے لئے معافی چاہتا ہوں۔ وجہ یہی عدیم الفرصتی ہے۔ لیکن تمہارے خیال سے غافل نہیں ہوں اس لئے اپنا دل مضبوط رکھو۔ یہ سب کچھ جلد گزر جائے گا۔

۷

۱۷ر اگست ۱۹۵۱ء

کل تمہارا خط مِلا۔ یہ سُن کر اطمینان ہوا کہ مکان کی صورتِ حال تشویشناک نہیں ہے جیسا کہ خدشہ تھا۔ مجھے اُمید ہے کہ اس بارے میں حکم امتناعی شاید ہو جائے اور تمہیں گھر چھوڑنا نہ پڑے۔ عدالت کے دفتر سے پتہ چلا کہ ججوں نے زوردار سفارش لکھی ہے اور اگر اخبارات نے میرے حق میں (بلکہ تمہارے حق میں) کوئی کلمۂ خیر لکھا ہے تو میری گرفتاری کے بعد فضا بہت بدل چکی ہوگی۔ میری طرف سے خلیل[۱]، نظامی[۲] اور اُن سب دوستوں کا انتہائی شکریہ ادا کر دینا جنہوں نے اس آڑے وقت میں تمہارا ساتھ دیا ہے۔

---

[۱] لاہور کے ایک صحافی [۲] حمید نظامی مرحوم مدیر نوائے وقت لاہور۔

اَب رسائل کے بارے میں تردد کی ضرورت نہیں۔ افتی[1] کا انبار چھوڑ گئے ہیں جو بہت دنوں تک چل جائے گا۔ البتہ فرانسیسی کی کچھ ابتدائی کتابیں اور لغات بھجوا دیے۔ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ہمیں فرانسیسی پڑھائیں گے۔ یہاں دماغی کام میں کچھ زیادہ جی نہیں لگتا لیکن اپنی سی کوشش ضرور کریں گے۔ مجھے پڑھنے کا ایک لیمپ بھی چاہیئے اگر گھر میں کوئی زائد لیمپ ہو تو بھجوا دو۔

شاید ہم یہاں تم سے زیادہ آرام دہ زندگی گزار رہے ہیں لیکن ایک بات پر رشک آتا ہے اور وہ ہے تمہاری برسات۔ یہاں صرف ایک دفعہ بارش ہوئی ہے لیکن اس کا لاہور کی برکھا سے کیا مقابلہ۔ خیر شائد یہ بھی ٹھیک ہے۔ اچھا مینہہ برسے تو اس سے اچھی یادیں تازہ ہوں گی اور یہاں یادوں سے زیادہ لو لگانا اچھا نہیں۔ البتہ یہاں کے بے رنگ اور یکساں موسم میں خرابی یہ ہے کہ وہ انبساط اور اہتزاز جس سے شعر کی اُمنگ پیدا ہوتی ہے دل کو میسّر نہیں آتا۔ یہ مقدّمہ تو شیطان کی آنت ہے۔ نہ جانے کب تک چلے اس لئے تم اپنے آرام اور بیسوں کے مطابق ملاقاتوں پر راشن مقرر کرو۔ بچّوں کو دیکھنے کو دل چاہتا ہے لیکن تمہارے یا اُن کے آرام کی قیمت پر نہیں۔

بدقسمتی سے میرے ذہن میں کوئی ایسی تجویز نہیں جس سے تمہاری مالی امداد کی کوئی صورت نکل سکے۔ لیکن سُنا ہے کہ کراچی اور بعض دوسرے شہروں میں میری[2] کتاب کی مانگ ہے اور اس کی اشاعت کے لئے پُرانے یا کسی نئے ناشر سے معاملہ طے کر لو۔ البتہ یہ احتیاط لازم ہے کہ کتاب ہمارے اپنے پریس میں چھپے۔ نذیر یا صوفی[3] صاحب اس بارے میں مشورہ دے سکیں گے۔ یہاں کوئی نئی بات بتانے کی نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ بارک میں ایک اور نفر کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ محمد حسین عطا ہیں (تم انہیں نہیں جانتی ہو) اَب ہمارے ہاں عجیب و غریب طائفہ جمع ہے جس میں پٹھان، پنجابی، کشمیری، یوپی والے، اسلامی سوشلسٹ، نیشنل سوشلسٹ، کمیونسٹ، ایک عدد قادیانی اور کچھ بالکل غیر سیاسی لوگ

---

[1] میاں افتخار الدّین مرحوم [2] نقش فریادی [3] صوفی غلام مصطفٰے تبسّم

شامل ہیں۔ میرا شمار نہ جانے کس زمرے میں ہے۔ (اگرچہ میں جانتا ہوں کہ سی۔ آئی۔ ڈی کی فائلوں میں اپنی تشخیص کیا ہے) یہ بہت ہی خوش دل مجمع ہے اور سب ہی بہت اچھے لوگ ہیں۔

اِمتحان میں تمہارے نتائج کا سُن کر بہت خوشی ہوئی۔ موجودہ حالات میں تمہارے فرسٹ کلاس کو بہت بڑھیا فرسٹ کلاس سمجھنا چاہیئے تم نے نمبر بھی مجھ سے زیادہ حاصل کئے ہیں۔ جو اپنی جگہ ایک کارنامہ ہے۔ اِس کا تاسف ضرور ہے کہ تمہاری مزید تعلیم کے بارے میں اس وقت ہم کوئی منصوبہ نہیں بنا سکتے لیکن اُمید ہے کہ تم ایم۔ اے فائنل کے لئے اپنی تعلیم جاری رکھ سکو گی۔

کچھ معلوم نہیں کہ یہ خط تمہیں کب تک ملے گا اس لئے اپنی سالگرہ کی مبارکباد ابھی سے قبول کرو۔ آئندہ تمہیں سالگرہ کا تحفہ بھیجنا کبھی نہیں بھولوں گا۔

۸

۱۸ر اگست ۱۹۵۱ء

یہ سُن کر خوشی ہوئی کہ تمہارے گھر کا معاملہ آخر طے ہوگیا۔ اس بات پر تھوڑی سی ندامت ہوتی ہے کہ اِن سب قصّوں سے نپٹنے کے لئے میں نے تمہیں اکیلا چھوڑ دیا ہے۔ لیکن شاید یہ بھی ایک طرح سے اچھا ہی ہے۔ مُشکلات کا سامنا کرنے اور اُن پر قابو پانے کی صلاحیت ایک ہی طریقے سے حاصل ہوسکتی ہے اور وہ یہ کہ آدمی عملی طور سے یہ کر کے دیکھے۔ بہرحال اپنا حوصلہ بحال رکھو اس لئے کہ ابھی ہمیں بہت دن جینا ہے اور بہت کچھ دیکھنا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اَب ہماری جوانی کی عمر نہیں ہے اور ضعیفی سے پہلے کے یہ چند سال بہت قیمتی ہیں۔ لیکن پھر بھی اپنے پاس بہت وقت پڑا ہے۔ اپنے یہاں مجھے اس بات پر ہنسی بھی آتی ہے اور تھوڑا سا تاسف بھی ہوتا ہے کہ ہمارے نوجوان ساتھی ہم سے بالکل اس طرح پیش آتے ہیں جیسے ہم کوئی بڑے بوڑھے سفید ریش بزرگ ہیں۔ خاص طور سے ایک نوعمر کپتان[1] نے جیسے ہم قرآن کا درس دیتے ہیں بالکل پیر بنا رکھا ہے۔ ہماری

---

[1] سابق کپتان خضر حیات۔

برادری میں فوجی عہدوں کی کوئی پروا نہیں کرتا اور ہر کسی کو اپنا کام خود کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ہمیں یہاں بھی یہ رعایت حاصل ہے کہ پانی کا گلاس یا سگریٹ کی ڈبیہ اُٹھانے کے لیۓ خود بستر سے اُٹھنے کی زحمت برداشت نہیں کرنی پڑتی۔ کوئی نہ کوئی بڑھا دیتا ہے۔ چنانچہ لائل پور جیل میں ہم نے جتنی اچھی عادتیں سیکھی تھیں اب چھوٹتی جا رہی ہیں اور اپنی فطری کاہلی واپس آرہی ہے۔

افتی نے تم سے بالکل غلط کہا ہے کہ میں انہیں کمزور نظر آرہا تھا بات یہ ہے کہ ہماری ملاقات رات کو کافی دیر میں ہوئی اور کچھ کھنچے کھنچے سے ماحول میں، شاید اس سبب سے اُنہیں کچھ مغالطہ ہوا ہو، انہیں خیال تھا کہ مجھے ان سے شکایت ہے اس لیۓ انہوں نے آتے ہی اپنے عذر بیان کرنے شروع کئے جس سے ہمیشہ ہماری طبیعت اُلجھتی ہے۔ چنانچہ جس ہنسی خوشی سے ملاقات ہونی چاہیئے تھی نہ ہو سکی جس کا افسوس ہے۔ بہرحال واقعہ یہ ہے کہ ہم ہرگز بھی نحیف و نزار نہیں ہیں بلکہ لائل پور جیل میں جو دس پونڈ وزن گھٹا یا تھا وہ دوبارہ بڑھ رہا ہے۔ یہاں رنج دہ بات صرف ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ ریت اور مٹی کی وجہ سے سب لوگ گنجے ہوتے جا رہے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ یہاں سے باہر آنے تک ہماری سب "سیکس اپیل" ختم ہو چکی ہوگی۔ یہ بہت المناک واقعہ ہوگا۔ اس کے بعد ہم پر تہمتیں تراشنے والے بیچارے کیا کریں گے۔ آخر ایک بوڑھے گنجے بزرگ کے بارے میں کوئی کیا اسکینڈل ایجاد کر سکتا ہے۔

کتابیں پہنچ گئی ہیں۔ یعنی عدالت میں پہنچ گئی ہیں اور غالباً دو چار دن تک مل جائیں گی۔ میزی کے لیۓ۔ ابا کی طرف سے سالگرہ مبارک

۹

۲۸ر اگست ۱۹۵۱ء

تمہارا ۲۳ر تاریخ کا لکھا ہوا خط بچّوں کی تصاویر سمیت آج ملا۔ تمہارے

۱؎ یہ قید تنہائی کا زمانہ تھا۔

بچے کتنے خوبصورت ہیں اور کتنے بڑے نظر آنے لگے ہیں۔ یہاں اور باتوں کے علاوہ سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ میں اُنہیں اپنے سامنے بڑے ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ اگرچہ تمہاری نگرانی میں ان کی تربیت کے بارے میں مجھے کوئی تشویش نہیں ہے اُن کی تربیت میں میرا تو اتنا ہی حصہ ہو سکتا تھا کہ انہیں خوش رہنا سکھاؤں اور اُن کی خوب ناز برداری کروں۔ اگر وہ خود غرض، کم ظرف اور حریص نہ بن جائیں (اور مجھے معلوم ہے کہ ایسا نہیں ہوگا) اور اگر ان میں یہ شعور پیدا ہو جائے کہ کیا چیز باعزت ہے اور کیا نہیں ہے تو وہ جیسے بھی اپنی زندگی بسر کریں ٹھیک ہے۔ ہمارے دوست سُرجیت سنگھ[1] نے کہا تھا "Peace comes from within" اگر وہ یہاں ہوتے تو میں انہیں بتاتا کہ اس کے صحیح معنی کیا ہیں۔ اب صحیح طور سے پتہ چلا ہے کہ اگر اپنے دل میں جُرم و گناہ کا کوئی احساس نہ ہو تو آدمی عذاب اور دُکھ درد، سب مفارقتیں، سب سختیاں، سب صعوبتیں، غرض وہ سب کچھ برداشت کر سکتا ہے جو باہر سے اُس کی ذات پر نازل ہوں۔ صرف گناہ کا احساس، خطا کاری کا احساس یا اپنے آپ سے دغا کرنے کا احساس ایسی چیز ہے جس کا کوئی مداوا، کوئی علاج نہیں ہو سکتا اس لئے کہ یہ داخلی چیز ہے اور اس کا احساس زندگی بھر اپنے ساتھ رہتا ہے۔ اس کے خلاف اگر اپنی نیکی اور بے گنہی پر یقین ہو جیسا کہ اس مُصیبت میں مجھے اور تمہیں ہے تو سب بے وجہ کی تکالیف و حادثاتِ شعر کی اصطلاح میں سمندِ شوق کو تازیانے کا کام دیتے ہیں۔

کتاب[2] کے بارے میں یہ ہے کہ اس کا آخری ایڈیشن چوتھی طباعت تھی جس میں کچھ تصحیح کا کام باقی ہے۔ اگر تم خود چھپوا سکو تو اچھا ہے بشرطیکہ کوئی دوست اُس میں امداد کر سکے۔ انتساب پر غالباً آج کل کوئی تصفیہ نہیں ہو گا اس لئے آج کل ہمارے سب دوست (خواتین و حضرات دونوں) یہ ثابت کرنے کی فکر میں ہوں گے کہ اُن کی ہم سے کبھی آشنائی نہ تھی۔

---

[1] گورنمنٹ کالج، لاہور میں ساتھی تھے اور بعد میں آل انڈیا ریڈیو شملہ میں ملازم ہو گئے۔

[2] نقشِ فریادی۔

گزشتہ ہفتہ سے پاکستان ٹائمز ملنا شروع ہو گیا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ کوئی بچھڑا ہوا بچہ دوبارہ آملا ہے۔ اب جبکہ میرا خون پسینہ اس کی اشاعت پر صرف نہیں ہو رہا ہے اور میں اسے الگ تھلگ ہو کر دیکھ سکتا ہوں تو یہ خاصا بھلا اخبار معلوم ہوتا ہے۔ البتہ بلاک کی چھپائی کچھ اچھی نہیں ہے۔ کسی کی سرزنش ہونی چاہیئے۔

۱۰

۹ ستمبر ۱۹۵۱ء

آج اتوار ہے۔ صبح آنکھ کھلی تو روزمرہ کی طرح اپنی بارک کی بے رونق دیواروں اور چارپائیوں کے جم غفیر کے بجائے ایک نرم و نازک پودے پر نظر پڑی جو ہوا میں جھوم رہا تھا۔ اس کے مہین پتوں میں سے دُور کہیں ایک آدھ ستارہ جھانک رہا تھا اور ایک بہت بڑا سفید پرندہ مرواریدرنگ آسمان کی جانب محوِ پرواز تھا۔ یہ عجوبہ اس لئے ہوا کہ دو دن پہلے ہمیں کچھ اور رعایتیں دی گئی ہیں جن میں ایک یہ ہے کہ اب ہم اگر چاہیں تو باہر کھلے میں سو سکتے ہیں۔ پہلی دو راتیں تو میں نے بارک کے اندر ہی گزار دیں۔ دل میں اب بھی کچھ نازک مقام ایسے ہیں جن سے کوئی یاد چھو جائے تو دُکھنے لگتے ہیں۔ اس لئے صحرائے سندھ کے گداز آسمان اور پچھلے پہر کے اُداس چاند کو دیکھنے سے ڈر سا لگتا تھا لیکن کل رات ہمارے بارک روم میں کچھ ایسی بھگدڑ مچی کہ آخر مجھے بھی باہر آنا پڑا۔ باہر کی مانوس فضا سے بار بار نیند اچٹتی رہی لیکن یہ بے خوابی برا سودا نہیں تھا، صرف اس وجہ سے نہیں کہ باہر رات کا منظر کچھ اور ہوتا ہے بلکہ اس لئے بھی کہ اب موسم بھی بدل چکا ہے اور گرمیوں کی اکتا دینے والی یکسانیت کے بجائے ہوا، روشنی اور آسمان دن رات میں کئی بار دل تڑپا دینے والے رنگ بدلتے ہیں۔ خاص طور سے شام ڈھلے جب پہلے پہل ستارے طلوع ہوتے ہیں تو آسمان کے نظارے سے محض وسعت اور فاصلے ہی کا احساس نہیں ہوتا بلکہ اس میں رنگ و حرکت کے اُتار چڑھاؤ سے ایسے گوناگوں نقشے بنتے ہیں کہ دل خوش ہو جاتا ہے۔ آج کل بہت شدت سے اپنی زندگی کا سب سے دلکش بسیرا یاد آرہا ہے۔ یعنی دلی میں لودھی روڈ والا گھر اور بارش کے بعد گردوپیش کا

سماں، پٹھان مقبروں کے گرانڈیل گنبد، وہ ہمارے گھر کے سامنے کا طلسمی پل اور اسے چومتی ہوئی کہکشاں کی کمان۔ اس درد کی چبھن دل میں نہ ہو تو آدمی کبھی پوری طرح محسوس ہی نہ کر پائے کہ زندگی کس قدر مہربان اور کتنی حسین ہے۔

افسوس کہ ہم نے کبھی گاؤں میں چھٹیوں کے دن ساتھ نہیں گزارے ورنہ میں تمہیں کچھ اور بھی پرانی یادوں میں شریک کر سکتا۔ جو آج کل یہاں چھٹیوں کی صبحیں دل میں جگاتی رہتی ہیں۔ جیل خانے کے صحن میں چارپائیوں کی قطار اور لپٹے ہوئے بستروں کے انبار، اونچی اونچی دیواروں پر تیز روشنیاں اور لانبے سائے، ہر طرف غنودگی اور کسلمندی کی سی فضا تیز رو ہوا میں پتوں کی سرسراہٹ پر بہتے ہوئے پانیوں کی آواز کا دھوکہ، ان سب باتوں سے اپنے گاؤں میں چھٹیوں کے وہ بیتے ہوئے دن یاد آتے ہیں جب ہم بہت چھوٹے تھے اور ہل اسٹیشنوں پر جانے کا ابھی فیشن نہیں چلا تھا۔ یہاں آس پاس کسی طرح چند بھینسیں اور رہٹ کی رُوں رُوں پیدا ہو جائے تو گاؤں کا منظر مکمل ہو جائے۔

میں جیل خانے کی رعایتوں کی بات کر رہا تھا۔ ہمیں ایک ریڈیو سیٹ بھی مل گیا ہے۔ آرام کرسی، میز کی لیمپ اور کچھ ساز و سامان کا بھی وعدہ ہو چکا ہے۔ اب تو ہم میں سے بعض کو یہ فکر لاحق ہو گئی ہے کہ یہاں سے نکلے تو یہ معیارِ زندگی کیسے قائم رکھ سکیں گے۔

تاثیرؔ[۱] کا مسوّدہ جب بھی ملا میں صاف کر کے بھجوا دوں گا۔ کرسٹس اور بچّے کیسے ہیں۔ اخبارات میں کرس کا نام بار بار نظر آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی بڑی خدائی فوجدار ہو گئی ہیں۔ یہ بھی دیکھا کہ بیگم عرفان اللہ کی تصویر آخر کار پاکستان ٹائمز میں چھپ ہی گئی۔ اور وہ بھی بہت نمایاں طور سے۔

---

[۱] ڈاکٹر محمد دین تاثیر۔ بیگم تاثیر کا نام شادی سے پہلے کرسٹابیل جارج تھا۔ کرس مخفف ہے۔ کرسٹابیل کا بیگم تاثیر اور بیگم فیض سگی بہنیں ہیں۔

اور کوئی نئی خبر نہیں ہے سوائے اس کے کہ عید کے لئے بڑے پیمانے پر ایک ضیافت کا اہتمام ہو رہا ہے۔ پہلی دفعہ تمام اسیروں کے بیوی بچے یہاں جمع ہوں گے اور ہمیں اجازت مل گئی ہے کہ اس دن ہم سب مل کر کھانا کھا سکیں۔ چنانچہ آج کل مرغ قورمہ اور بریانی کے سوا دوسرا موضوع گفتگو نہیں۔

۱۱

۱۹ ستمبر ۱۹۵۱ء

چھٹی کا ہفتہ ختم ہونے کو ہے اور کل سے ہم پھر اپنی روزمرہ دفتری مشقت شروع کریں گے (اپنی عدالت کو ہم دفتر کہتے ہیں)۔ اس ہفتے میں ہمارے ہاں دو عدد سوشیل تقریبات منعقد ہوئیں۔ پہلی تو دوسرے گھر میں رات کے کھانے کی دعوت تھی جس پر میں اور ایک اور صاحب مدعو تھے۔ یہ تقریب اس خوشی میں منعقد ہوئی کہ بریگیڈیر لطیف خاں کو ان کی بیگم نے کافی بنانے کا ایک پرکولیٹر اور کچھ آم اور پھل بھیجے تھے۔ اپنے کو یہ تاثر دلانے کے لئے ہم باہر کھانے پر جا رہے ہیں۔ ہم نے نہا دھو کر پُر تکلف لباس پہنا اور دیر تک گپ کرتے رہے۔ دوسری شاندار تقریب وہ عید پارٹی تھی جس کا ذکر پہلے کر چکا ہوں۔ اس میں پہلی بار مجھے بچوّں کی ہنسی کی دلکش موسیقی کا احساس ہوا اگرچہ اس سے پہلے مجھے بچوّں کا شور رغل بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔ بہت جی چاہا کہ تم بھی یہاں ہوتیں لیکن شاید اچھا ہی ہوا کہ تم نہیں تھیں۔ اس قسم کی ملاقات کا انجام ہمیشہ درد و حسرت کا خمیازہ ہوتا ہے۔ مجھے تمام وقت یہ خیال ستاتا رہا کہ مسرّت اور خود فراموشی کے چند لمحے گزر جانے کے بعد ان بیچارے بیوی بچوّں کے دل میں رنج و فراق کا گھاؤ اور بھی گہرا ہو جائے گا۔ لذّت پرستی کے فلسفے میں اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا کہ اگر وقتی لذّت کے بعد اس لذّت سے زیادہ دُکھ اٹھانا پڑے تو اس لذّت سے گریز کرنا چاہئے۔ اس سوال کا حل مشکل اس لئے ہے کہ اس لذّت اور درد کا تناسب پہلے سے دریافت نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں ہم زندگی کی چھوٹی موٹی تفصیلات میں اتنے اُلجھے رہتے ہیں کہ اخلاق و فلسفے کے بے کار

مسائل سے اُلجھنے کے لئے نہ وقت ہے نہ دماغ۔ مثال کے طور پر ابھی کچھ دن پہلے ہمیں ایک ریڈیو سیٹ عنایت ہوا تھا اور سب لوگ اس میں ایسے ہی منہمک رہتے ہیں جیسے بچے بھی اپنے فلمی گانوں میں۔ پھر ہمارے وارڈ کی کالی بلّی نے دو تین بہت نازک سفید اور سیاہ بچے دیئے اور سب لوگ پرورشِ اطفال کے پیچیدہ مسائل میں غرق ہو گئے۔ اس کے بعد عید کے کھانے کی تفصیلات پر بحث و تکرار شروع ہوئی۔ ان کے علاوہ بیسوں مسائل اور بھی ہیں۔ مثلاً کوٹھڑیوں کے پردے کیسے ہوں گے؟ پڑھنے کی میزیں کب ملیں گی؟ صبح کی چائے کس وقت آئے گی وغیرہ وغیرہ اور اس تمام مدّت میں یکساں دنوں کی ساکن سطح پر یاد کے سائے لمبے ہوتے جا رہے ہیں اور وقت کی نبض دیکھتے دیکھتے سُست رفتار ہوتی جا رہی ہے۔ اب دن چھوٹے ہوتے جا رہے ہیں اور صبح جب ہم چائے کے لئے اُٹھتے ہیں تو رات کا اندھیرا کچھ کچھ باقی ہوتا ہے۔ نہ جانے کتنے سالوں کے بعد شب کے خاتمے پر اندھیرے میں پو پھٹنے کا سماں اور چاند کے ہلکے نقرئی رنگ کو روپہلی بنتے دیکھا ہے۔ جیل کی دیواروں کے باوجود یہ سب کچھ حسین ہے اور ایسے لمحوں میں زندگی کی سب بیوفائیوں کے باوجود اس کا شکرانہ ادا کرنے کو جی چاہتا ہے۔

آج تاثیر کی کتاب[1] ملی۔ دو تین دن میں جو کام درکار ہے ختم کر کے واپس بھیجدوں گا۔ جی چاہتا ہے کہ کچھ زیادہ سکونِ قلب اور اطمینان خاطر میسّر ہوتا، تاکہ اس پر کچھ زیادہ توجہ دے سکتا۔ بہرصورت اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا۔ تاثیر کی نظموں کا کیا ہو رہا ہے۔ اگر مسوّدہ تیار ہے تو کیا وہ بھی اس کتاب کے ساتھ نہیں چھپ سکتا۔ حمید[2] احمد خاں اس کے لئے سوانحی خاکہ لکھ سکتے ہیں۔ اور کسی تمہید یا دیباچے کی ضرورت نہ ہونی چاہئے۔

۱۲

۲۴ ستمبر ۱۹۵۱ء

سالگرہ مبارک اور تمہیں ایسے بہت سے دن دیکھنے نصیب ہوں۔ اب کے

---

[1] ڈاکٹر تاثیر کا مختصر ناول کنول [2] سابق وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی۔

انتظار اور سہی ..... صاحب کے بارے میں تمہاری کہانی سے کافی لُطف آیا۔ خوشی کی بات ہے کہ ان کی سہیلیوں کا جھُرمٹ بدستور باقی ہے اور تم ان میں سے ایک سے مل بھی چکی ہو۔ میری نظر میں یہ عورتیں دنیا کی بہترین مخلوق میں سے ہیں۔ محبّتی، فراخدل اور بہت خوش مزاج۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے رسمی اخلاق کا معیار کتنا ناقص ہے اس لئے کہ ہم شخصی اخلاق کو صرف ایک ہی ناقابلِ ذکر پیمانے سے ناپنا چاہتے ہیں اس سے خیال آیا کہ ہمارے یہاں ایک نوجوان نے کنزے رپورٹ منگوائی ہے جو میں آج کل پڑھ رہا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب بہت ہی عمدہ کارنامہ ہے۔ جی چاہتا ہے کہ کسی طریقے سے یہ کتاب یہاں سب خواتین و حضرات کو پڑھوائی جائے۔ اس کے مطالعہ سے بہتوں کا بھلا ہوگا۔ صوفی سے کہو کہ اپنی تازہ چیزوں کی نقل ہمیں بھجوا دیں، ہمارے سیاہی دوست سخت شاعر مزاج ہوتے جا رہے ہیں۔

اگر بچے مارچ کے مہینے میں زیادہ سہولت سے آسکتے ہیں تو جب تک انتظار کرلو۔ یہاں رہائش کے بارے میں تشویش کی ضرورت نہیں۔ جیسا انتظام تم چاہو گی ہو جائے گا۔ مجھے اُمید ہے کہ اخبار کے بارے میں میری نکتہ چینی پر میرے رفیق کار رنجیدہ نہیں ہوئے ہوں گے۔ اخبار کی صورت پھر بہتر ہوتی جارہی ہے اور غالباً گزشتہ دنوں کی کوئی محض وقتی خرابی پیدا ہوگئی ہوگی۔ ہاں تمہارا ریڈیو کالم کون لکھتا ہے؟ کافی معقول شخص معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے شاید ہی کبھی ریڈیو سُنا ہو۔ اس لئے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ ہماری نشریات کتنی پوچ ہیں۔ یوں ہی سا گمان تھا کہ ان کا معیار کافی گھٹیا ہے لیکن اب پتہ چلا ہے کہ یہ گھٹیا پن میرے تصوّر سے کہیں زیادہ گھٹیا ہے۔ اپنے ریڈیو کے نقّاد سے کہنا کہ نشر کردہ خبروں پر ذرا توجہ دیں اور ان پر تفصیل سے تنقید کریں۔ میں نے ایسی بکواس آج تک نہیں سُنی۔ خبروں کے ہر نشریے میں ہر روز تین چوتھائی حصّہ اس بات کی نذر ہو جاتا ہے کہ فلاں وزیر صاحب نے فلاں اعلان کیا یا فلاں انکشاف کیا جو اعلان اور انکشاف وہ سو بار پہلے بھی کر چکے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ خبروں کے شعبے کو خبروں اور سیاسی اعلانات میں فرق ہی نہیں معلوم۔

تم نے کرسمس کے ہاں سالگرہ پارٹی کا حال نہیں لکھا۔ ہمارا ایک عشق گزیدہ نوجوان تفصیلات کے لئے بے قرار ہے اور کچھ لکھنے کو نہیں ہے سوائے اس دلی تمنّا کے کہ تمہاری مصیبتوں کے خاتمے میں زیادہ تاخیر نہ ہو۔

۲۴

۶ / فروری ۱۹۵۲ء

کل رات پانی برسا اور آج صبح ایک شفاف دُھلی ہوئی نومولود دنیا کا سا سماں ہے جسے دیکھ کر دل کو فرحت ہوتی ہے۔ آج من کی کیفیت بہتر ہے اور شاید جلد ہی کچھ لکھا جا سکے۔ ذرد زرہ کے ہلکے سے آثار محسوس ہو رہے ہیں۔ تمہاری خاطر جی چاہتا ہے کہ ہم زیادہ قابل بن جائیں، زیادہ لکھیں اور اپنے فرائض پر زیادہ توجہ دیں لیکن میں نے دیکھا ہے کہ جیل خانہ اصلاحِ نفس کی جگہ نہیں ہے۔ خاص طور سے جب اس مقدمے کا لا متناہی سلسلہ، بیوی بچّوں کا فکر، خاندانی جھگڑے اور ایسے اور دنیاوی قصّے باہر کی زندگی سے بھی زیادہ ذہن پر سوار ہوں۔ جیل خانے میں اِن باتوں سے ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کے لئے اظہار اور تکمیل کے بیشتر راستے مسدود ہوتے ہیں۔ بہر حال صورتِ احوال جو ہے سو ہے اس لئے شکایتیں بیکار۔ میں ان باتوں کو زیادہ دل سے نہیں لگاتا۔ لیکن پھر بھی کبھی کبھار چوک ہو ہی جاتی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں یہ عیاشی بھی میسّر نہیں۔ اس لئے کہ تمہاری آزمائش مجھ سے زیادہ سخت ہے لیکن شاید وہ دن زیادہ دور نہیں جب میں تمہارے کاندھوں سے یہ صلیب ہٹا سکوں اور تم آرام کر سکو۔ یہاں کوئی نئی خبر نہیں ہے اور جیل خانے کا نیا پن ختم ہو جانے کے بعد اب زندگی بالکل ساکت ہو چلی ہے، عمل کے ذرائع اتنے محدود ہیں کہ کوئی نئی بات عجوبہ واقعہ ایجاد ہی نہیں کر سکتے۔ لا محالہ اپنی شخصیت اور اپنے ذہن کے ذخائر پر تکیہ کرنا پڑتا ہے اور اس خود بینی کی وجہ سے ایک ناقابلِ برداشت بور بن جانے کا ڈر لگا رہتا ہے۔

۲۵

۱۷ / فروری ۱۹۵۲ء

جیسا کہ تم تصور کر سکتی ہو ہم سب ملک معظم مرحوم کے ماتم میں مصروف ہیں۔

(God Shave the queen) نہ جانے تم نے سول اینڈ ملٹری گزٹ کا کراچی ایڈیشن دیکھا ہے یا نہیں۔ بالکل لوٹ پوٹ کر دینے والی چیز ہے۔ بہت لبھانے والے انداز میں لکھا ہے کہ ملک معظّم کی وفات پاکستان کا ناقابلِ تلافی نقصان ہے اور ساری قوم غم واندوہ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ یہاں بعض ساتھیوں نے کہا کہ پاکستان ٹائمز میں بھی ایسی ہی خرافات چھپے گی جس پر ہم نے شرط بدی کہ ایسا نہیں ہوگا۔ شکر ہے کہ تم لوگوں نے میری لاج رکھ لی مجھے افسوس ہے کہ تمہیں میرے خط غیر تسلّی بخش معلوم ہوتے ہیں۔ اپنی اصلاح کی کوشش کروں گا۔ لیکن مجھے خیال نہیں تھا کہ کوئی ضروری بات ایسی رہ گئی ہے جس کا میں نے جواب نہیں دیا۔ اگر کبھی ایسا ہو تو مجھے یاد دلا دیا کرو۔ یہاں کبھی کبھی ایسے بُرے دن بھی آتے ہیں جب دماغ پر یکایک کاہلی اور بے حسی کا دورہ پڑتا ہے۔ گزشتہ دنوں کچھ ایسی ہی کیفیت تھی لیکن اَب گزر چکی ہے اور اَب تم ہمارا برتاؤ بہتر پاؤ گی۔ ہم نے فرانسیسی بھی دوبارہ شروع کر دی ہے۔ اس زبان کے مبادیات ذہن نشین ہو گئے ہیں۔ اور میں خود مطالعہ جاری رکھ سکتا ہوں۔ اَب تمہارے سوالات کے جواب لکھتا ہوں۔

۱ — ڈاک بنگلے میں اکیلے کمرے کا کرایہ تین روپے اور ڈبل کمرے کا کرایہ پانچ روپئے روزانہ ہے۔ عام طور سے یہاں جگہ مِل جاتی ہے لیکن اگر تم اپنی تاریخ کا اندازہ بتا دو تو کمرہ پہلے سے محفوظ کرایا جا سکتا ہے۔

۲ — ان کمروں کے ساتھ الگ باورچی خانے کا انتظام نہیں ہے اس لئے کھانے پینے کا معاملہ گڑبڑ ہے۔ لیکن تمہارے آنے پر نوازش یا بیگم جنجوعہ کچھ انتظام کر دیں گی۔ (اب انہوں نے اپنا باورچی رکھ لیا ہے۔)

۳ — نوازش کی فیس کا معاملہ ابھی طے نہیں ہوا ہے۔ لیکن مہینہ ختم ہونے سے پہلے کچھ ادائیگی کرنی پڑے گی بشرطیکہ ہمارے سرکار اپنا وعدہ ایفا کریں۔

۴ — چند روز اور کا اقرار اَب بھی قائم ہے۔

۵ — اگر تم اپنے گھر والوں سے وہ رقم منگوا لو جس کا وعدہ ہوا ہے تو اچھی بات ہے۔ اس لئے کہ اگر کوئی غیر متوقع دِقت پیش آئی تو سہولت رہے گی لیکن یہ بات اپنے تک رکھو۔

بالٹی کی اماں کا سُن کر رنج ہوا۔ لیکن تم نے یہ نہیں لکھا کہ اُنہیں تکلیف کیا ہے۔ اور مرض کتنا خطرناک ہے۔ اُمید ہے کہ وہ جلد صحت یاب ہو جائیں گی اور بالی کو دوبارہ تمہارے پاس بھیج سکیں گی۔ اگر اس میں زیادہ دیر ہو تو کیا تم کسی غریب طالبہ کو گھر نہیں رکھ سکتیں؟ تمہاری اس بہیتی لڑکی کا کیا ہوا جس کا شاہین یا ایسا ہی کچھ نام تھا؟

تمہارا ایکھراج والا قصہ بہت دل خوش کُن ہے اگرچہ مجھے اس کے کسی ایک لفظ کا اعتبار نہیں۔ اِسے سُن کر یہاں کے نوجوان ساتھی جو ہمیشہ اپنی فتوحات کی ڈینگیں مارتے رہتے ہیں بہت جلے۔

یہ سُن کر خوشی ہوئی کہ فلم ریڈیو لکھنے کی وجہ سے تمہاری کچھ تفریح ہو جاتی ہے لیکن لکھنے کی مشقّت میں بھی اضافہ ہو گیا ہو گا۔ یہاں مجھے صرف ایک ہی مستقل تشویش درپیش رہتی ہے۔ (اور صرف اسی ایک بات پر جرُم کا احساس ہوتا ہے) کہ یہ سارا بوجھ جو تمہارے کندھوں پہ آ پڑا ہے تمہاری برداشت سے باہر نہ ہو جائے۔ اگرچہ تمہاری قوّتِ برداشت پر دل بہت نازاں ہے۔ شاید میں نے لکھا تھا کہ اپنی شخصیت کی گہرائیوں کا کم از کم ایک بار امتحان ضرور ہونا چاہیئے تاکہ یہ پتہ چل سکے کہ وہاں کیا ہے کیا نہیں ہے۔ بہت تھوڑے لوگ ایسے ہوں گے جنہیں کبھی نہ کبھی یہ امتحان پیش نہ آئے۔ اگرچہ بیشتر لوگ سمجھتے ہیں کہ اِن کی باری کبھی نہیں آئے گی۔

اگر اس قصہ کا خاتمہ بالخیر ہوا اور مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہو گا تو سارے دُکھ درد کے باوجود یہ سودا سُودمند ثابت ہو گا۔ اس کا موذی اور غیر اخلاقی پہلو صرف ایک ہے اور وہ ہے بیش قیمت وقت کا مجرمانہ زیاں۔ عمر کے غلط حصّے کا ایک پورا سال ختم ہو چکا ہے اور بہت تھوڑے وقت میں جو بہت کچھ کرنے کو ہے۔ اس میں سے کوئی بھی کام پورا نہیں ہو سکا۔ بدقسمتی سے جیل خانے کی نفسیاتی اُلجھنیں اس کی اجازت نہیں دیتیں کہ

---

[1] فیض کی سوتیلی بہن۔ پورا نام سلمیٰ اقبال۔

[2] ایک مہاجر لڑکی جو اسلامیہ کالج لاہور میں پڑھتی تھی۔

اس جبری فراغت سے کوئی مفید کام نکل سکے اگرچہ اس کا احساس اور اس کی تمنا دل میں مستقل رہتی ہے۔ بہرصورت جیسے تمہارے ابا نے لکھا ہے Jonh bull can take it اس لئے حوصلہ بلند رکھو۔

تمہارے پچھواڑے کے صحن میں سرسوں کی کچھ شاخیں پھوٹ نکلی ہیں اور گیہوں کے نازک پودوں میں بالیاں آنے لگی ہیں۔ اپنی لمبی صبحوں میں ہم بہار کی ان علامتوں کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں اور ان کے رنگ و خوشبو سے زندگی خوش آئند معلوم ہونے لگتی ہے۔ جیل خانے کی زندگی ہی سہی۔

۲۶

۲۳ فروری ۱۹۵۲ء

تمہارا خط دیکھے ہوئے یوں لگتا ہے کہ بہت زمانہ گزر چکا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ تم خیریت سے ہوگی اور یہ خاموشی محض اُس سودے بازی کی وجہ سے ہے جس کا تم نے ذکر کیا تھا۔ چھیمی اور مریم[1] کو غالباً میرے خط مل چکے ہوں گے۔ گزشتہ ہفتہ آپا[2] یہاں آئی تھیں اور کھانے کی بہت سی مزے کی چیزیں لائی تھیں جن کی سب نے مناسب تعریف کی۔ لکھنؤ سے رضیہ[3] کا ایک بہت اچھا خط آیا تھا اور لندن سے مارس[4] جونز کا۔ مارس کے خط سے معلوم ہوا کہ اس کی حسین بیوی اسے چھوڑ گئی ہے اور وہ قاہرہ میں دل بہلا رہے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ ارادہ ہو تو ہر چیز کا کوئی نہ کوئی بدل مل ہی جاتا ہے۔

تم نے میرے گزشتہ خط کی رسید نہیں بھیجی یہ خط لکھنے کے بعد مجھے افسوس ہوا کہ میں نے کسی کے مرنے کے بارے میں کچھ نازیبا باتیں لکھی تھیں۔ اس بارے میں تم نے گزشتہ خط میں صحیح ملامت کی تھی۔ بے خیالی، تعصب یا کسی اور وجہ سے دل دُکھانا بہت آسان ہے لیکن اپنے دل میں اتنی جامع شفقت پیدا کرنا بہت مشکل ہے کہ انسان اپنے دکھوں

---

[1] ڈاکٹر تاثیر کی بیٹی۔ شادی کے بعد بیگم جمیل حسن۔ [2] فیض کی بڑی بہن بیگم عبدالحمید۔

[3] رضیہ سجاد ظہیر [4] فوج میں رفیق کار۔ اب ڈرہم یونیورسٹی میں سیاست کے اُستاد۔

کے ساتھ باقی ہر کسی دُکھ کا احاطہ کرسکے ۔ خیر، کوشش شرط ہے ۔

تم کب آؤ گی؟ اسیری کے دن مختلف دائروں میں دھیرے دھیرے گردش کرتے ہیں ۔ کبھی سکون، کبھی بے حسی، کبھی اکتاہٹ، کبھی درد اور ہر دائرے کی گردش کے بعد شدّت سے انتظار پیدا ہوتا ہے کہ اب کوئی آئے یا کوئی نئی بات وارد ہو اس لئے جلدی لکھو کہ تم کب آؤ گی تاکہ میں اپنا انتظار کسی خاص دن سے وابستہ کرسکوں ۔ آتی دفعہ اپنے ساتھ ایک دو سبز پوش اور عربی کتابیں لیتے آنا ۔ سنٹس بری کی تاریخ تنقید پہلی جلد، لائف ڈیورنگ دی ایسٹ انڈیا کمپنی کی تین جلدیں اور Myer کا ناول[1] جو ایک جلد میں ہے ۔ یہ سب کتابیں گھر میں موجود ہیں ۔ نذیر ٹائپسٹ سے کہنا کہ اگر دفتر میں جی آر اسٹیونس[2] کا کناڈا کا پتہ موجود ہو تو بھیج دے ۔ میں انہیں خط لکھنا چاہتا ہوں ۔ حفیظ[3] کی نظم کا سُن کر خوشی ہوئی ۔ اگر نقل مل سکے تو بھجوا دو ۔ آج کل ہمارے ہاں ایسی چیزوں کا بہت قحط ہے اور بہت ٹھوس قسم کے مطالعے میں زیادہ جی نہیں لگتا ۔ اخباروں سے پتہ چلتا ہے کہ لاہور میں خوردنی اشیاء کی صورتِ حال کافی خراب ہے اور کبھی کبھی اس بات سے تشویش ہوتی ہے کہ تمہیں ہمارے تصور سے زیادہ تنگ دستی کا سامنا نہ ہو ۔ مصائب کے سیاہ بادلوں میں ایک سفید دھاری یہ بھی ہوتی ہے کہ اس سے لوگ خوابِ غفلت سے جاگتے ہیں ۔ لیکن اس احساس سے فائدہ جبھی ہوتا ہے کہ اس سے مثبت عمل پیدا ہو ورنہ یہ احساس بیکار رونے پیٹنے میں تحلیل ہو جاتا ہے ۔ جیل خانے میں آدمی بالکل بے دست و پا ہوتا ہے ۔ لیکن اس لاچارگی کی وجہ سے اپنے ہم وطنوں کے دُکھ درد کا احساس اور بھی شدید ہو جاتا ہے اور کچھ احساسِ گناہ بھی کہ ہم اس سے الگ تھلگ بیٹھے ہیں ۔

یہاں کافی گرمی ہو چلی ہے اور گرمیوں کا موسم کسی ہوّے کی طرح قریب محسوس ہونے لگا ہے ۔ لیکن مجھے اب بھی اُمید ہے کہ ہم یہ موسم کسی بہتر جگہ پر کسی زیادہ خوشگوار

---

[1] The root and the plower

[2] فوج کے رفیق ۔ اب جریدہ نگار ہیں ۔ [3] حفیظ ہوشیارپوری ۔

فضا میں بسر کر سکیں گے۔ چنانچہ میں نے صحرائے سندھ کی آندھیوں اور بیزار کن ہواؤں کا خیال جو یہاں کی بے برگ و بار گرمیوں میں دھول اُڑاتی رہتی ہیں، دل سے ہٹا دیا ہے۔ ان کی جگہ میں نے تمہارے خیال، بچوں کی ہنسی اور اُس مسرت کے تصوّر کو تخت نشین کر دیا ہے جو ہمارا حق ہے۔ وہ مسرت جو ساری انسانیت کا حق ہے۔ وہ مسرت جسے صرف تھوڑے ہی عرصہ کے لئے غصب کیا جا سکتا ہے اور جو ہمیشہ انتظار کے شایاں ہے۔

۲۷

۳ مارچ ۱۹۵۲ء

مجھے افسوس ہے کہ پچھلے ہفتے خط نہیں لکھ سکا۔ وجہ یہ تھی کہ ہم سب ذرا زیادہ مصروف تھے۔ منظور قادر[۲] یہاں پر تھے اور اُن سے بہت سے معاملات طے کرنے تھے۔ اس ملاقات سے خوشی ہوئی۔ اگرچہ مقدمے کے قانونی نکات پر بحث کے سوا ایک بات بھی نہ کر سکے۔ حتیٰ کہ میں اصغریٰ[۲] بیگم کے نام سلام بھی نہ بھجوا سکا۔ اب میری طرف سے تم پہنچا دینا۔

خط و کتابت میں ہم پھر پیچھے رہ گئے ہیں اس لئے کہ تمہارے تین خط یکبارگی وصول ہوئے جس سے دل خوش بھی ہے اور نادم بھی۔ میں کوشش کروں گا کہ یہ حساب برابر ہو جائے۔ شاید تمہیں عجیب لگے لیکن یہاں خط نہ لکھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ جب یہاں اُن چیزوں کی یاد جو دل کو عزیز ہیں زیادہ ستانے لگے تو یہ یادیں اتنی شفیق خوبصورت اور گرمانے والی محسوس ہوتی ہیں کہ ان کے مدوجزر میں رکاوٹ ڈالنے کو دل نہیں چاہتا۔ تم کہو گی کہ یہ اپنی کاہلی اور سہل انگاری کا جواز پیدا کرنے کا ایک بہانہ ہے اور تمہارا کہنا ٹھیک بھی ہے۔ میں نے شاید پہلے بھی لکھا تھا کہ جیل خانے کی زندگی میں بہت سی چھوٹی چھوٹی خود غرضیاں ابھر کر نمایاں ہو جاتی ہیں۔ قید سے پہلے پردہ نشین خواتین کی ذہنیت کا کبھی ایسا شعور پیدا نہیں ہوا تھا

---

[۱] فیض کی جانب سے وکالت کی۔ [۲] بیگم منظور قادر۔

جیسا کہ اب ہے ۔ یہ ذہنیت ہر قیدی کی عام ذہنیت ہے ۔ اب معلوم ہوا کہ کم ظرفی، گھٹیا پن، چھوٹی چھوٹی اُلجھنوں سے اتنی لگن کہ وہ عالم گیر مسائل دکھائی دینے لگیں اور واقعی اہم اور غیر ذاتی مسائل سے قطعی بے تعلقی، کینہ پروری، بدمزاجی، کبھی خود سری، کبھی خاک بوسی، کبھی ہاتھ پاؤں ہلانے سے قطعی گریز اور کبھی بے وجہ کی بھاگ دوڑ یہ سب باتیں مقید اور محکوم زندگی کے عام ذہنی اور عملی لوازمات ہیں جو آسانی سے آزاد لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے ۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود کچھ اچنبھے یہاں کی زندگی میں بھی ہوتے ہیں ۔ مثلاً اگلے دن میں نے دہلی سے ہندوستانی موسیقی کے لئے ریڈیو کھولا (ہمارے پاکستانی ریڈیو پر جو چیز موسیقی کہلاتی ہے اس میں بعض عطائی لوگوں کی جیں بیں کے علاوہ کچھ سننے میں نہیں آتا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے سب اچھے موسیقار برکت علی خاں، رفیق[1]، پکھراج[2] وغیرہ وغیرہ ریڈیو والوں پر حرام ہیں ۔) تو معلوم ہے ہم نے کیا سُنا ۔ تم کبھی نہیں بوجھ سکو گی ۔ ریڈیو پر اس زمانے کے سب سے بڑے وائلن بجانے والے Yehudi Menuhin انڈین فلم فسٹول ہال میں Back اور Pagannini کے نغمے بجا رہے تھے ۔ بعد میں جب میں نے اس کے بارے میں سوچا تو بہت رشک بھی آیا اور غصہ بھی ۔ اس ملک کو قائم ہوئے پانچ برس ہو چکے ہیں اور اس پانچ برس میں ہم نے اپنے لوگوں کے لئے حسن، تہذیب اور پاکیزہ فرحت کا کوئی بھی سامان فراہم نہیں کیا ۔ اگرچہ اس دوران میں اور طرح طرح کے "تماشے" ہر روز برپا ہوتے ہیں ۔ ہمیں صرف یہی سوجھتا ہے کہ دنیا بھر کے خالی الذہن بڑے بوڑھوں کو یک جا کریں پھر اُن سے خرافات کا طومار اُگلوائیں جنہیں کوئی بھی رتی بھر اہمیت نہیں دیتا ۔ یا یہ کریں کہ کچھ لوگوں کو نشستن و خوردن اور گلا پھاڑنے کی سہولتیں بہم پہنچائیں اور پھر برخاستن کے بعد یہ سب کچھ بھول جائیں ۔ ہندوستان ہم سے بڑا ملک سہی لیکن کلچر یا تہذیب کا تعلق ملک کے سائز سے نہیں ہوتا ۔ سوچنے اور رہنے سہنے کے آداب و اطوار سے ہوتا ہے ۔

---

[1] رفیق غزنوی [2] ملکہ پکھراج ۔

تو کیا وجہ ہے کہ ہمارے ملک کے لوگ اگر بہت عمدہ تہذیب برت نہیں سکتے تو کم از کم اس کے نمونے تو دیکھ سکیں۔ خیر شاید کبھی نہ کبھی ایسے دن بھی آئیں گے اور شاید مجھے اس بارے میں لکھنا بھی نہ چاہیئے۔

ہاں تو میں اچنبھے کی باتوں کا ذکر کر رہا تھا۔ گزشتہ ہفتے ہمارے ہاں ایک لڑکے کے لئے اس کے گاؤں سے گاجر کا حلوہ آیا۔ ہم اسے چھیڑا کرتے تھے کہ اس کے لئے جو مٹھائی وغیرہ آتی ہے وہ اکیلے اکیلے چٹ کر جاتا ہے۔ غالباً اس بات سے چڑ کر اس نے گاؤں میں گاجر کے حلوے کا آرڈر بھیجا۔ جب یہ حلوہ یہاں پہنچا تو جانتی ہو کتنا تھا ایک پورے چھکڑے کا بوجھ یعنی تین بڑے بڑے کنستر جو کم از کم بیس بیس سیر کے ہوں گے۔ یعنی کوئی ڈیڑھ من حلوہ۔ بھئی ذرا غور کرو کہ کتنے من گاجریں اور کتنے من شکر اور کتنا گھی اس کے لئے فراہم کیا گیا ہوگا۔ ہم سب لوگ گاؤں میں حلوے کی تیاری کے منظر کا تصوّر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گاجروں کے چھکڑے چلے آ رہے ہیں، گھی کی کئی کڑھائیاں جمع کی جا رہی ہیں، ایندھن کے پہاڑ لگ رہے ہیں اور پورے علاقے میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔ غالباً یہ دن اس علاقے کی تاریخ میں ایک اہم واقعہ قرار دیا جائے گا۔ اس کے بارے میں قصّے کہانیاں اور گیت لکھے جائیں گے۔ کیونکہ دنیا کی تاریخ میں آج تک پندرہ آدمیوں کے لئے بہ یک وقت ڈیڑھ من حلوہ کبھی تیار نہیں ہوا۔ چنانچہ آج کل صبح دوپہر شام سب کو صرف حلوہ کھانے سے کام ہے۔

میں نے موسم کا ذکر کیا تھا۔ ان دنوں پھر بادل چھا رہے ہیں اور ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ تمہارے آنے تک یہ موسم ایسا ہی رہے عمرِ رائیگاں کا افسوس نہ ہو تو واقعی بہت خوشگوار فضا ہے۔ لیکن اس بات کا افسوس کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا اور یوں تھا تو کیوں تھا۔ بیکار چیز ہے جو کچھ تھا وہ اس سے بدتر بھی ہو سکتا تھا اور الٹا یا آرزو سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ جو کچھ ہے یا ہوگا وہ البتہ بہتر ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کا انحصار ہم پر ہے اور ہم اس کے لئے کوشش کریں گے۔

اگر حالات بدستور رہے تو تمہارے جوتشی اور بڑھیا عورت (وہ کون ہے؟) کی

بات شاید غلط نہ ہو اس لئے چند روز اور فقط چند ہی روز نہ۔ میری گانے والی دوستوں کی تم سے رفاقت کا سُن کر خوشی ہوئی (ان کے بارے میں تمہاری باتوں سے یہاں اکثر خوش گپیاں رہتی ہیں۔ اور ہم اس پر کافی اتراتے ہیں۔ یہاں کے دوست سمجھتے ہیں کہ اگر تم یہ سب خرافات بغیر کسی اعتراض کے برداشت کر لیتی ہو تو تم بہت ہی بڑھیا آدمی ہو گی اور ہم انہیں بتاتے ہیں کہ اصل معاملہ کیا ہے ورنہ ہمارا اور تمہارا دونوں کا بھرم کچھ کم ہو جائے گا) یہ سُن کر بھی تسکین ہوتی ہے کہ اپنے بیوی بچوں کے علاوہ ایک دو آدمی ایسے بھی ہیں جن کے لئے اپنا غیب و حضور اتنی اہمیت رکھتا ہے — ایسے وقتوں میں اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ اپنے حقیقی دوست کتنے تھوڑے ہیں لیکن اگر ایک دو بھی ہوں تو ان حالات میں انہیں نعمتِ غیر مترقبہ سمجھنا چاہیئے۔ میں خالص ذاتی دوستوں کی بات کر رہا ہوں۔ جہاں تک عام دوستوں کا تعلق ہے ان سے تو دنیا بھری ہوئی ہے۔

جنجوعہ[1] کی بچی اب بہتر ہے۔ اُسے نمونیا ہو گیا تھا لیکن اب بالکل صحت یاب ہو چکی ہے اور وہ لوگ کچھ دنوں کے لئے کراچی چلے گئے ہیں۔ جنجوعہ نے بچی کی عافیت پوچھنے کیلئے تمہارا شکریہ ادا کیا ہے اور اپنی بیگم کو تمہارا پیغام پہنچا دیا ہے۔

پاکستان ٹائمز کا گُم شدہ شمارہ پہنچ گیا ہے اور یہاں کے پڑھنے والوں نے تمہارے بچوں کے کالم پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس میں دولتِ مشترکہ کا ذکر زیادہ ہے اور باقی دنیا کا بہت کم۔ اس کی وجہ تو مجھے معلوم ہے یعنی یہ کہ لکھنے کا مواد کہاں سے زیادہ دستیاب ہوتا ہے اور کہاں سے کم۔ یہ اعتراض تمہیں یہ بتانے کے لئے لکھ رہا ہوں کہ یہاں کے لوگ تمہاری تحریروں میں کافی دلچسپی لیتے ہیں۔

تو تمہاری مسز روز ویلٹ سے بھی ملاقات ہو گئی۔ ان کا جو قول تم نے نقل کیا ہے اس سے تمہاری بہ نسبت ان کی اپنی تعریف نکلتی ہے۔ انہیں کبھی پردیسی سرزمین پر اپنی تحریروں سے روزی کمانے کی ضرورت نہیں پڑی اور جو اُن کی تحریریں میں نے ڈان میں دیکھی ہیں وہ دُو رَدُّورہ

---

[1] جیل کے ساتھی اور سابق ایئر کموڈور۔

تک تمہارے کالم تک نہیں پہنچتیں (اب میرا کوئی ارادہ نہیں کہ تم باورچی گیری اور برتن مانجھنے کے فرائض دوبارہ ادا کرو۔ اب تو ارادہ یہی ہے کہ کچھ دن ہم بیگم فلاں کے میاں کے فرائض انجام دیں گے) تو ہمارے ہاشمی[1] بھائی امریکہ جا رہے ہیں۔ اگر ہم اسیرِ زنداں نہ ہوتے تو انہیں بہت سے عمدہ تعارفی خط دے سکتے تھے۔ تم نے Zelma Brandt کا پوچھا ہے۔ یہ وہی اچھی سی بڑھیا امریکن خاتون ہیں جو تین چار برس پہلے لاہور آئی تھیں۔ اور ہم اُنہیں شہر دکھانے لے گئے تھے۔ غالباً تم اُن سے ملی تھیں اس لئے کہ وہ ایک مرتبہ دوپہر کے کھانے پر ہمارے گھر آئی تھیں۔ انہیں ضرور جواب لکھو اور ان کے پیار کے جواب میں ہماری طرف سے پیار بھیجدو اور یہ بھی لکھ دو کہ اگر وہ ہمیں خط لکھنا چاہیں تو ہمیں خوشی ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ Steve[2] کے بارے میں تمہارا خدشہ صحیح نہیں ہے اور میں یہی دریافت کرنے کے لئے انہیں لکھنا چاہتا ہوں کہ وہ بقیدِ حیات ہیں کہ نہیں۔ ان کا خیال اس لئے آیا کہ گزشتہ دنوں بوڑھے ڈکنسن[3] اور نوجوان لطیف[4] کی موت کا پڑھ کر بہت قلق ہوا۔ دونوں اتنے اچھے خوش مزاج اور پیارے آدمی تھے۔

میرے خیال میں فی الحال مجھے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے لیکن اگر ہو سکے تو I. A. Richards کی تینوں کتابیں ساتھ لے آنا یعنی Principles of Criticism
Meaning of Meaning اور Practical Critism

اچھا ہوا کہ آپا نے تمہاری علالت کا ذکر نہیں کیا۔ نہ تم نے اس کے بارے میں لکھا۔ لیکن جب ایسی کوئی بات ہو تو دل خود گواہی دینے لگتا ہے اور اب ویسے ہی فکر لاحق رہنے لگی ہے جیسے تمہیں رہا کرتی تھی۔ لیکن ہم یہاں اس روشنی پر نظر جمائے رکھتے ہیں جو تاریکی سے پرے فروزاں ہے۔ جس کا وجود برحق ہے جو کبھی نہ کبھی دکھائی دے گی جس کے لئے انتظار کرنا لازم

---

[1] بشیر ہاشمی سابق وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی۔ [2] کرنل جی آر اسٹیونس۔ فوج میں فیض کے افسر۔ ادیب اور صحافی۔
[3] ایرک ڈکنسن جو گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے استاد تھے۔ [4] پروفیسر ایم اے لطیف جو پہلے گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے استاد تھے اور بعد میں صوبہ سرحد میں ناظم تعلیمات ہو گئے تھے۔

ہے خواہ انتظار کیسا ہی کٹھن کیوں نہ ہو۔

۲۸

۱۷ مارچ ۱۹۵۲ء

اب کے جواب پھر دیر سے لکھ رہا ہوں اس لئے کہ گزشتہ ہفتے میں مصروفیت زیادہ تھی۔ اور ہمیں اپنی صفائی کے بیانات پیش کرنے تھے۔ یہ کافی ناخوشگوار اور ذلّت آمیز کام تھا۔ خاص طور سے مجھ جیسوں کے لئے، اس لئے کہ مجھے اپنی ذات اور افعال کے بارے میں کچھ کہنے سے بہت چڑھ ہے اور ہم اپنے دوستوں سے بھی حتی الامکان یہ باتیں نہیں کرتے۔ بہر حال یہ قصّہ تمام ہوا اور اب ہم آرام سے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ کر سستا سکتے ہیں۔ باقی کام وکیلوں کا ہے اور بلاشبہ وہ جی بھر کے ایک دوسرے سے قیل و قال کریں گے۔ عدالت پندرہ دن کے لئے بند ہے۔ آج ہمارا چھٹی کا پہلا دن ہے۔ صبح سات بجے سے کچھ اوپر وقت ہے۔ دھوپ ابھی تک ہمارے صحن میں نہیں پہنچی۔ سب لوگ ابھی تک بستر میں ہیں (آج کل ہم برآمدے میں باہر سوتے ہیں۔) میں نہا دھو کے حجامت بنا کے تیار ہو چکا ہوں جس سے ہمارے نیم بیدار ساتھی مچھر دانیوں میں سخت حیران و پریشان ہو رہے ہیں اس لئے کہ عام طور سے میں سب سے آخر میں اٹھتا ہوں۔ ایک دو نے Scandalised آواز میں پکارا ہے کہ تکلیف کیا ہے۔ کیا گورنر صاحب نے ناشتے پہ بلایا ہے یا ریٹا ہیورتھ ملاقاتیوں کے کمرے میں بیٹھی ہے۔ دراصل "تکلیف" یہ ہے کہ ہم اصلاحِ نفس کی کبھی کبھار کوشش کا پھر ارادہ کر رہے ہیں اس لئے کہ اب کے واقعی کچھ کام ختم کرنے کا ارادہ ہے۔ کچھ نامکمل نظمیں مکمل کرنا چاہتا ہوں۔ ضیاءؔ[1] کی کتاب کا مسودہ باقی ہے اور اپنی پرانی اور نئی نظموں کی ترتیب کا بھی ارادہ ہے۔ بہت سے خط بھی جواب طلب ہیں۔ ایک خط بالی کا ہے، ایک رضیہ[2] کا ایک قاسمی[3] کا اور ایک مارس جونس کا۔ دوسروں

---

[1] عزیز ضیاء، اسسٹنٹ ایڈیٹر پاکستان ٹائمز [2] فیض کی بہن رضیہ سجاد ظہیر

[3] احمد ندیم قاسمی۔

کے مقابلے میں میری ڈاک بہت کم ہے لیکن پھر بھی اسے کافی عیاشی سمجھنا چاہئے۔ یہ ختم کرنے کے بعد تھوڑا سا پڑھنے کا ارادہ ہے۔ اس کے بعد ہم سب کافی کے لئے دوسرے گھر جائیں گے جسے خانقاہ یا ہاؤس آف لارڈز کہتے ہیں۔ کل رات میں نے کراچی ریڈیو کھولا تو ایک خاتون اسٹیفن اسپینڈر پر تقریر کر رہی تھیں۔ تمہیں معلوم ہے کون تھیں؟ جبؔ کی دوست مایاؔ۔ میں نے بنّے کو بتایا تو وہ بھی تھوڑے سے جذباتی ہو گئے۔ غالباً لکھنؤ میں انہیں جانتے تھے۔ سہیلیوں کا ذکر آیا تو ۔ ۔ ۔ ۔ کی شادی کی خبر سے تھوڑا سا تاسف ہوا۔ کچھ لوگوں کو غالباً زیادہ صدمہ ہوا ہو گا۔ مجھے تو اس کی صورت بھی ٹھیک سے یاد نہیں۔ غالباً صرف ایک ہی دفعہ دیکھا ہے۔ جب ہم Andy، Tilly اور فیروزہ کے ساتھ اس کے گھر گئے تھے۔ مجھے یاد ہے رات بہت جا چکی تھی لیکن اس کے باوجود ہماری بہت تواضع کی گئی۔ چائے اور کیک اور پھل اور نہ جانے کیا کیا چیزیں پیش کی گئیں۔ خیر ان تفریحات سے ہمیں جتنی دلچسپی ہے تمہیں معلوم ہے اگرچہ ہم ظاہر یہی کرتے ہیں کہ ہے۔ یہ صرف میں اور تم جانتے ہیں کہ دراصل ہم کچھ Inhibited صوفی قسم کی چیز ہیں لیکن عام لوگوں سے یہ بات چھپائے رکھتے ہیں تاکہ شاعرانہ شہرت پر حرف نہ آئے۔ یہ خط پہنچنے تک غالباً تم نے اپنے آنے کی تاریخ طے کر لی ہو گی۔ میرے خیال میں تمہیں اپوا کی میٹنگ کی رپورٹ لکھنی ہے تو ان کا تماشہ دیکھ آؤ۔ ضرور دلچسپ ہو گا۔ نوازش یہاں پر نہیں ہیں۔ اِن کا خانساماں موجود ہے۔ اس لیے تمہیں کوئی زحمت نہیں ہو گی۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ نہانے کا ایک تولیہ چاہئے۔ پہلا والا پھٹ چکا ہے۔ اگر زیادہ فضول خرچی نہ سمجھو تو اپنے بیرا کو ساتھ لیتی آؤ۔ اس سے یہاں تمہیں آرام رہے گا۔ اور میں چاہتا ہوں کہ تم بچوں کو یہاں سے کراچی کی صنعتی نمائش دکھانے لے جاؤ۔ میری نئی کتاب سے جو پیسے ملنے کی توقع ہے اس سے یہ خرچ پورا ہو جائے گا۔ غالباً ایک ایڈیشن کے ایک ہزار روپے تو مل ہی

---

[۱] آل انڈیا ریڈیو کے سومناتھ چِب [۲] اب مسز مایا جمیل [۳] امریکی جریدہ نگار اینڈ رو راتھ۔ مختصر نام اینڈی۔ [۴] ٹلی نام تھا اینڈرو راتھ کی بیوی کا۔

[۵] امرتسر کے ایک دوست فیروز الدین۔

جائیں گے۔ جس لطیف کا میں نے اپنے خط میں ذکر کیا تھا یہ وہی لطیف ہیں جن کا تم سوچ رہی ہو۔ کالج میں مجھ سے دو سال سینئر تھے۔ پشاور میں اچانک دل کے دورے سے فوت ہو گئے۔ بہت دکھ کی بات ہے۔ میزو کا خط پڑھ کر بہت لطف آیا۔ باقی لوگوں نے بھی لطف اٹھایا۔ خاص طور سے اس کی دعا سن کر جو بالی نے اپنے خط میں لکھی ہے۔ (اے ہمارے آسمانی باپ جو حیدرآباد جیل میں ہے وہاں تمہاری مرضی پوری ہو جیسے اس جہاں میں ہے وغیرہ وغیرہ)۔

۲۹

۲۵ مارچ ۱۹۵۲ء

امید ہے یہ خط تمہیں وقت پر مل جائے گا۔ انتظار کا صرف ایک ہفتہ باقی ہے اور تم یہاں ہو گی۔ تم نے اپنی بیماری کا ذکر کیا ہے جس سے ڈر لگ رہا ہے۔ خدا کرے کہ تم واقعی میں بیمار نہ ہو ورنہ دل رنجیدہ ہو گا۔ تمہارا پچھلا خط بہت افسردہ تھا جسے پڑھ کر دکھ ہوا۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے لئے دل شکنی اور آزردگی کے کافی اسباب موجود ہیں تو ایسے جذبات کی عیاشی بھی جائز ہے لیکن اگر لڑائی میں اپنا پلہ بہت کمزور ہو تو پھر آدمی بد دلی اور کم ہمتی Afford نہیں کر سکتا۔ بہ ظاہر یہ بات غیر منطقی معلوم ہوتی ہے لیکن دراصل صحیح ہے۔ زندگی کی جدوجہد میں صرف جدوجہد ہی کافی نہیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ انسان یہ لڑائی بشاشت اور خوش طبعی سے لڑے اور اپنے پر دردمندی اور ترحم کے جذبات نہ طاری ہونے دے ورنہ غنیم کا پلہ اور بھی گراں بن جاتا ہے۔ میں جانتا ہوں ایک حد تک یہ اپنے اپنے مزاج کی بات ہے اور آدمی بالارادہ وہ سب کچھ نہیں کر سکتا جو اسے کرنا چاہیئے لیکن مشکلات کیسی بھی ہوں اپنی طرح کی کوشش تو لازم اور واجب ہے۔ یہاں بیٹھ کر میں تمہاری امداد اور دلجوئی کے لئے اور تو کچھ نہیں کر سکتا سوائے اس کے کہ تمہیں اس طرح کی بیکار اور ناقابلِ عمل نصیحتیں لکھتا رہوں جن سے غالباً تمہیں جھنجھلاہٹ ہوتی ہو گی۔ میں تو یہ اس لئے کرتا ہوں کہ مجھے تم پر اعتماد ہے اور اس لئے کہ اپنی محبت کے سوا یہاں سے اور کچھ تمہیں پیش بھی نہیں کر سکتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ شاید اب وہ دن دور نہ ہو جب بادل چھٹ جائیں گے اور ہماری زندگی میں بہار لوٹ آئے گی۔

بنّے کی بیگم نے بنّے کے وہ خطوط شائع کئے ہیں جو انہوں نے سن ۴۲-۴۰ء میں جیل خانے سے لکھے تھے (وہ کوئی ڈھائی برس جیل میں رہے تھے) انہیں پڑھ کر بہت ہنسی آئی اس لئے کہ ہماری طرح وہ بھی مسلسل معذرت کرتے رہتے ہیں۔ کبھی وقت پر نہ لکھنے کی، کبھی کسی کی سالگرہ بھول جانے کی اور اس سے بہت تقویت ہوئی کہ ہم ہی صرف واحد نالائق میاں نہیں ہیں۔

مجھ سے فرمائش کی گئی ہے کہ گذشتہ ہفتے کے بچّوں کے صفحے پر تمہیں یہاں کے لوگوں کی داد پہنچا دوں۔ افریقہ والی نظم بہت اچھّی تھی اور یہاں کے لوگ اس بات پر خوش ہیں کہ شاید اُن ہی کی تنقید کا نتیجہ ہے۔ تمہارے گھریلو بجٹ والی کہانی کا بہت لُطف آیا۔ گھر کی چھوٹی چھوٹی پریشانیاں اَب یاد میں بہت دلکش معلوم ہوتی ہیں اور ان کی جانب دوبارہ لوٹ جانا بہت دلفریب معلوم ہوتا ہے۔ یہ میں طنز کے طور سے نہیں کہہ رہا ہوں۔ واقعی ایسا ہی ہے۔ کچھ عجیب سی بات ہے کہ آدمی ماضی کے بارے میں سوچنے لگے تو صرف مسرّتیں اور خوشگوار چیزیں یاد نہیں آتی ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹی موٹی تلخیاں اور پریشانیاں سب وقت نے دل سے دھو ڈالی ہیں۔

دو نئی نظمیں لکھی ہیں اور اُمید ہے کہ تمہارے آنے تک ایک اور ختم ہو جائے گی۔ نئے مجموعے کی اشاعت کے بارے میں تم آؤ گی تو بات کریں گے۔

۳۰

۹ / اپریل ۱۹۵۲ء

اُمید ہے کہ تم خیریت سے پہنچ چکی ہو گی۔ میں اطلاع کے انتظار میں ہوں۔ تمہارے اور بچّوں کے خوش و خرّم چہرے دیکھ کر دل پہلے سے کہیں زیادہ خوش ہے۔ اگرچہ یوں لگتا ہے کہ یہ ملاقات کل کی بات نہیں دور دراز ماضی کا کوئی واقعہ ہے اور تم کل یہاں نہیں آئی تھیں کئی برس پہلے آئی تھیں لیکن جب برسوں تم یہاں تھیں تو یہاں یوں لگتا تھا جیسے ہم کبھی جدا ہی نہیں ہوئے۔ اور میں دفتر کی روزمرّہ کی غیر حاضری کے بعد حسبِ معمول تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ دل کے رشتوں میں وقت اور فاصلے اس طرح گھلتے ملتے اور

مٹتے اُبھرتے رہتے ہیں کہ اِن کے نت نئے نقشوں کا حقیقت سے کوئی واسطہ ہی نہیں رہتا۔ یعنی کوئی آجائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کبھی گیا ہی نہیں تھا۔ اور چلا جائے تو لگتا ہے کبھی آیا ہی نہیں تھا۔ شاید کسی دن یہ بات شعر میں ڈھل[1] سکے۔ لیکن یہ تو اتنا عام تجربہ ہے کہ بہت سے لوگ پہلے ہی لکھ چکے ہوں گے۔

یہ حسین وقفہ ختم ہوا اور زندگی پھر اپنے معمول پر آگئی ہے، لیکن اب یہ معمول اور بھی زیادہ بے رونق نظر آتا ہے۔ صبح چھ بجے اٹھنا، ناشتہ، عدالت، دوپہر کا کھانا، سہ پہر کا سونا والی بال، رات کا کھانا اور بستر۔ موسم پر مُردنی چھا چکی ہے۔ ہوا کا جھونکا تک اِدھر نہیں آتا۔ مچھر بہت ہیں۔ کتابیں بے مزہ معلوم ہوتی ہیں اور دماغ نے کام کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ یعنی پھر جیل خانے کے بُرے مُوڈ کی آمد آمد ہے۔ لیکن یہ بھی گزر جائے گا۔ صرف اِس کے گزرنے کا انتظار کرنا ہوگا۔

میرے خیال میں تم سب لوگ چیچک کے ٹیکے لگوا لو۔ یہاں جیل میں چیچک کا ایک کیس ہو گیا تھا اور ہم سب کے ٹیکے لگ چکے ہیں۔ تم تک اس کا اثر نہیں پہنچنا چاہئے، لیکن پھر بھی احتیاط بہتر ہے۔ تمہیں پوشنی[2] کی منگیتر کے لئے ایک خط ملے گا جو یہاں تمہارے حوالے نہ کیا جا سکا۔ اسے ڈپلومیٹک وسیلے سے منزلِ مقصود تک پہنچا دینا۔

۳۱

۱۵ اپریل ۱۹۵۲ء

تمہاری طرف سے کسی خبر یا اطلاع کا ابھی تک انتظار ہے۔ میرا خیال تھا کہ اس ہفتے اتوار کو کوئی خط آئے گا لیکن ابھی تک کچھ نہیں پہنچا اور اب مجھے تشویش ہونے لگی ہے۔ ہر بار تمہارے آنے پر تمہیں تاکید کرنا چاہتا ہوں کہ گھر پہنچ کے خیریت کا تار دیدینا لیکن ہر بار یہ کہنا یاد نہیں رہتا۔ اس لئے آئندہ کے لئے تم خود یاد رکھو۔ اگرچہ

---

[1] آئے تو یوں کہ جیسے ہمیشہ تھے مہرباں — بھولے تو یوں کہ جیسے کبھی آشنا نہ تھے۔

[2] ظفر اللہ پوشنی جو فیض کے ساتھ جیل میں تھے۔

مجھے تہہ دل سے اُمید ہے کہ اَب تمہیں یہاں آنا نہ پڑے گا۔ اَب تم سے ملنے کے لئے ہمارے آنے کی باری ہے۔

مجھے خدشہ ہے کہ میرا گزشتہ خط کچھ افسردہ کن تھا۔ جس کا بہت افسوس ہے۔ بات یوں ہے کہ اپنے عزیزوں سے ملنے کے بعد ملاقات کی مسرّت کے باوجود اپنی تنہائی کا احساس اور بڑھ جاتا ہے۔ صرف اپنی محرومی کی وجہ سے نہیں بلکہ اِس وجہ سے بھی کہ آدمی ان عزیزوں کا حق ادا کرنے سے قاصر ہے جو دُہری محرومی ہے۔ خیر اَب یہ موڈ گزر چکا۔ موسم بھی کچھ بہتر ہو گیا ہے اور ہم پھر بشاش اور خوش ہیں۔ دن اب بھی گرم ہیں لیکن راتوں کو ٹھنڈک ہو جاتی ہے۔ ہوا چلتی ہے اور باہر سونا اچھا لگتا ہے۔ میں لاہور کا درجۂ حرارت ہر روز دیکھتا ہوں۔ تمہارے ہاں درجۂ حرارت تو کم ہے لیکن وہاں ہماری صحرائی ہوا نہیں چلتی اس لئے غالباً گرمی بڑھ چکی ہو گی۔

یہاں کوئی نئی خبر نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ اَب ہمارے دل زدہ عشاق نوجوانوں کی تعداد تین ہو چکی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان میں سچّا تو صرف ایک ہی ہے۔ باقی دونوں مکر کر رہے ہیں۔ بہر حال اس نفرت بھری دنیا میں کوئی پیار کی بات کرے تو اچھّا لگتا ہے اور اپنی نوجوانی کے دن یاد آتے ہیں۔ اُن دنوں کی بات چلی ہے تو مجھے دو بہت خوبصورت منظر یاد آئے، ایک امرتسر میں جیل خانے کے پیچھے سوکھی ہوئی نہر کا کنارا اور ایک شملے میں جا کر پہاڑی پر ایک ایسا گوشۂ تنہائی جہاں سے ہم نیچے کی پوری وادی دیکھ سکتے تھے لیکن ہمیں کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ شاید یہ مناظر تمہیں بھی یاد ہوں لیکن اتنی تفصیل میں یاد نہیں ہوں گے۔ جیسے مجھے یاد ہیں۔ وہ دن بعض اعتبار سے تکلیف دہ بھی تھے لیکن جیسے میں نے لکھا تھا یاد کے تکلیف دہ پہلو یاد میں نہیں آتے۔

۳۲

۲۲ اپریل ۱۹۵۲ء

تمہارے دونوں خط مل گئے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے گھبراہٹ

میں تمہیں تار بھیج دیا۔ اُمید ہے کہ تمہیں اس کی وجہ سے پریشانی نہ ہوئی ہوگی۔ جس دن میں نے تار دیا تھا اُس کے اگلے ہی دن تمہارا خط مل گیا تھا۔ اس لئے تمہاری خیریت کی اطلاع کے لئے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اُسی دن سے نوائے وقت کا پرچہ بھی آنا شروع ہو گیا اور حمید نظامی کا خط بھی ملا جس سے میں سمجھ گیا تھا کہ تم خیریت سے گھر پہنچ چکی ہو۔ اِس دوران میں اماں اور آپا یہاں آئے تھے، ان کے کراچی جانے سے پہلے دو دن اُن سے ملاقات ہوتی رہی۔ یہ کافی غمگین معاملہ تھا۔ یوں تو زندگی سبھی کے لئے صبر آزما ہے لیکن بوڑھے لوگوں کے لئے جنہیں زندگی میں بہت کم کچھ دیکھنے کو باقی ہے اور بھی زیادہ مشکل ہے۔ یہ سُن کر خوشی ہوئی کہ تمہاری طبیعت زیادہ بہتر اور بشاش ہے۔ اَب غالباً انتظار میں زیادہ دن باقی نہیں اس لئے حوصلہ قائم رکھو۔ میں بھی بالکل اچھی طرح ہوں لیکن آج کل ہمیں بہت ہی بُرے موسم کا سامنا ہے۔ ہر دن گرمی اور گھٹن اور گرد و غبار سے اٹا رہتا ہے۔ کچھ ویسا موسم ہے جیسا دہلی میں مئی کے مہینے میں ہوتا ہے۔ لیکن یہاں نہ لودھی باغ ہے نہ رات کو بُخاری[1] صاحب کے ساتھ آوارہ گردیاں یعنی نہ دن کی تمازت کے بعد شام کی ٹھنڈک میں گھر واپسی ہوتی ہے۔ اے ایس بی کو اگلے دن بھر ریڈیو پر سُنا تھا۔ یہ ان کی سیکیورٹی کونسل والی تقریر کا ریکارڈ تھا جو اَب شہرۂ آفاق ہو چکی ہے۔ میرے خیال میں اَب وہ اتنے بڑے آدمی ہو گئے ہیں کہ اگر میں انہیں خط لکھوں تو شاید ان کے لئے کسی پریشانی کا باعث نہیں ہوگا اس لئے میں لکھنے کے لئے سوچ رہا ہوں۔

یہ سُن کر خوشی ہوئی کہ اب بھی ایسے لوگ باقی ہیں جنہیں ہم جیسے راندۂ درگاہ لوگوں کی صحت میں دلچسپی ہے۔ ہماری صحت جس پر یہاں کے سب لوگ رشک کرتے ہیں بالکل اوّل درجے کی ہے البتہ اس سے تھوڑی سی تشویش ہے کہ لائل پور جیل میں جو وزن گھٹا یا تھا وہ دوبارہ بڑھنے لگا ہے۔ ۔ ۔ ۔[2] ۔ ۔ ۔ کے بارے میں سن کر رنج ہوا۔ نہ جانے ایسی کتنی لڑکیاں ہوں گی جنہیں زمانے کی شقاوت اور خود غرضی نوجوانی میں مایوسی

---

[1] احمد شاہ بخاری (پطرس) [2] فیض نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔

اور ذلّت کا شکار بننے پر مجبور کرتی ہے جس کے نتیجے میں نہ صرف ان کی اپنی زندگی میں بدی کا زہر گھل جاتا ہے بلکہ پھر یہی زہر ان کے ذریعے سے کئی دوسری زندگیوں میں بھی سرائیت کر جاتا ہے۔ اس کا الزام کس پر ہے اور آدمی گنا ہگار کسے ٹھہرائے؟ اس اجتماعی دُکھ درد کے علاوہ جو صرف معاشرتی انقلاب سے ہی سے دور ہو سکتا ہے انفرادی رنج وملال کے ایسے اسباب بھی بہت ہیں جو تھوڑی سی محبّت، شفقت اور سمجھ بوجھ سے اگر دُور نہیں کئے جا سکتے تو کم ضرور کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن محبّت اور شفقت کی طلب میں پکارنے والے اتنے زیادہ ہیں اور دینے والے اتنے کم کہ دردِ جگر اور شکستِ دل کا مداوا دُور دُور تک نظر نہیں آتا۔ بہرحال اس کی تلاش میں تگ و دَو پھر بھی لازم ہے اور جیسا کہ تم نے لکھا ہے اپنی بھلائی اسی میں ہے کہ آدمی دوسروں سے نیکی کرتا رہے البتہ اس کے عوض میں کسی صلے یا احسان مندی کی توقع نہ رکھنی چاہیئے ورنہ یقیناً مایوسی کا سامنا ہوگا۔ اگر آدمی نیکی کے عوض میں نیکی کی توقع رکھے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ دنیا کا نظام بجائے خود نیک ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سوچ غلط ہے اس لئے کہ ایک نیکوکار نظام میں سبھی کو نیک ہونا چاہئے اور کسی کو خاص طور سے نیکی کرنے کے لئے زحمت اٹھانے کی ضرورت نہ ہونی چاہیئے۔

ہم نے پھر لکچر بازی شروع کر دی اس لئے کوئی اور بات کریں۔ تمہارے بچّوں کے صفحے پر چین والے مضامین بہت اچھے ہیں۔ ایسے ہی مضامین کے لئے اب تم برمی، انڈونیشی اور ایرانی دوستوں سے فرمائشیں کیوں نہیں کرتیں۔ یقیناً کوئی نہ کوئی ایران اور مصر میں طلباء کی جد وجہد کا آنکھوں دیکھا حال لکھ سکے گا۔ اگرچہ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کوئی نہ کوئی کون ہے۔ تم نے بحث کے موضوعات کی فرمائش کی ہے۔ چند تجویزیں لکھتا ہوں۔

۱ — نصابی کتابیں :- دلچسپ نہیں، غیر دلچسپ ہیں، سستی ہیں، مہنگی ہیں۔ اس بارے میں تبادلۂ خیال کہ کیسی ہونی چاہئیں۔

۲ — اساتذہ :- اساتذہ میں کیا خوبیاں ہونی چاہئیں۔ ان کی شخصیت کیسی ہونی چاہیئے وغیرہ۔

۳ — مدارس :- لڑکیاں اور لڑکے سب سے زیادہ کس چیز کی کمی محسوس

کرتے ہیں اور سب سے زیادہ کس قسم کی سہولت یا آسائش چاہتے ہیں۔

۴۔ مساوات اور معاشرتی انصاف :۔ ان چیزوں سے کیا مراد ہے۔ پاکستان میں یہ کس حد تک موجود یا غیر موجود ہیں۔ اس بارے میں طلباء کو کیا کرنا چاہئے۔

۵۔ مخلوط تعلیم :۔ مخلوط تعلیم کا موجودہ نظام، نقائص اور اصلاح کی صورتیں۔

۶۔ دنیا میں اب تک کئی ملک غلام کیوں ہیں؟ ان کی غلامی کے ذمہ دار کون ہیں؟ ہم ان کی کیا امداد کر سکتے ہیں وغیرہ۔

مجھے یقین ہے کہ بچوں کو ان موضوعات میں دلچسپی ہوگی۔

۳۳

یکم مئی ۱۹۵۲ء

اس ہفتے میں تمہارے دو خط ملے۔ مجھے افسوس ہے کہ جواب دینے میں ذرا تاخیر ہوگئی۔ وجہ یہ تھی کہ پچھلے چند دن بہت گرمی پڑی جس سے طبیعت کسلمند ہو جاتی ہے۔ تمہاری زیبرا والی کہانی پڑھ کر ہنسی آئی۔ اگر تمہارا اشارہ اس طرف ہے کہ اپنے ایام جہالت میں ہم بھی ایسے ہی بدتمیز تھے تو یہ بات غالباً صحیح نہیں۔ اگرچہ اب یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ وہ دن اتنے دور اور غیر حقیقی معلوم ہوتے ہیں کہ ان دنوں کی باتیں اپنے پر گزری ہوئی نہیں بلکہ سُنی سنائی باتیں محسوس ہوتی ہیں۔

ہم جیل والوں کے لئے نوجوانی کی خرمستیوں کا اگر کوئی بدل یہاں رہ رہے تو وہ پھلوں کے صندوقچے پر نصف شب ڈاکہ ڈالنا ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ یہاں بعض لوگوں کو طبی سفارش پر کچھ فاضل پھل فروٹ ملتا ہے جسے وہ بوقت فرصت کسی مناسب موقع پر نوش جان کرنے کے لئے سینت کر رکھتے ہیں۔ لیکن باقی لوگوں نے سب ٹھکانوں پر اپنے جاسوس تعینات کر رکھے ہیں۔ جنہیں ہر چھپے خزانے کا پتہ رہتا ہے۔ ہر رات گیارہ بارہ بجے سازش مکمل ہوتی ہے اور بہت خاموشی اور نظم و ضبط

کے ساتھ شب خون کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ میری چارپائی سب سے محفوظ اور سب سے غیر مشتبہ جگہ ہے۔ اس لئے چوری کے مال کی تقسیم عام طور سے یہیں کی جاتی ہے جس کے نتیجے میں ہمیں رات کو کھانے پینے کی چیزوں کی کبھی قلت نہیں ہوتی۔

۳ مئی آج سہ پہر کچھ عجیب و غریب بات ہوگئی۔ یعنی مینہ برسا ہے، واقعی مینہ برس رہا ہے۔ اگرچہ اس بارش میں پنجاب کی برسات کا لطف اور شان و شکوہ کہاں۔ یوں لگتا ہے کہ کسی نے ایک بہت ہی خارش زدہ نحیف و نزار بادل میں کہیں ایک پرنالہ لگا دیا ہے جس سے پانی ٹپک رہا ہے۔ پھر بھی بارش ہی تو ہے۔ ہمارے برآمدے میں پانی بہہ رہا ہے اور چونکہ ان برآمدوں میں پی ڈبلیو ڈی کی مہربانی سے ڈھلان باہر کی بجائے اندر کو ہے اس لئے برآمدوں میں سے پانی چھپا چھپ ہمارے کمروں میں داخل ہو رہا ہے۔ اب سے کچھ دن پہلے افواہ اُڑی تھی کہ ہمارے کمروں میں چھت کے پنکھے لگائے جائیں گے۔ پھر کچھ پی ڈبلیو ڈی والے آئے اور جگہ جگہ سوراخ کر گئے۔ اس کے بعد پھر پی ڈبلیو ڈی کے مخصوص انداز میں یہ لوگ سب سوراخ ویسے کے ویسے چھوڑ کے غائب ہو گئے اور دوبارہ نظر نہیں آئے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان سب سوراخوں میں سے آبشار گر رہے ہیں۔ جیل کے وارڈ اور دوسرے قیدی بھاگ دوڑ میں مصروف ہیں۔ کوئی سیڑھی لگا رہا ہے کوئی کیچڑ کی بالٹی لئے جا رہا ہے۔ سوراخ بند کئے جا رہے ہیں، پانی نکالا جا رہا ہے۔ سامان اٹھایا جا رہا ہے اور ہنگامہ وہ ہے کہ ہنگامۂ شادی معلوم ہوتا ہے۔ میں نے بہ نفسِ نفیس اپنا بستر لپیٹا، چارپائی کھڑی کی، کتابوں اور میز کو کپڑے سے ڈھانپا اور اس کارگزاری کی وجہ سے بہت مستعد اور عالی مقام محسوس کر رہا ہوں۔

کسی[1] نے سرحد سے بہت عمدہ کھدّر بھیجا تھا جس سے میں نے کچھ جوڑے سلوا لئے ہیں اور اب مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ تمہارے ہاں جو کچھ تیار ہے بھجوا دو لیکن ململ یا کوئی اور نفیس کپڑا خریدنے کی قطعی ضرورت نہیں۔ مجھے پیسے بھیجنے کا تو خیال بھی نہ کرو۔ تمہارے جانے کے بعد کسی[2] نے کراچی سے کچھ بھیج دیا تھا جو بہت دنوں کے لئے کافی ہے۔ یہاں ہم خرچ

---

[1] صوبہ سرحد کے ارباب سکندر خاں [2] نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔

بھی کس چیز پر کریں۔ صرف کھانے پینے کا ایک مضمون ہے اور اس سے ہمیں شوق نہیں۔

۳۴

۱۱ مئی ۱۹۵۲ء

گزشتہ اتوار کو تمہیں اس لئے نہیں لکھا کہ تمہارے خط کا انتظار تھا اور وہ خط منگل کے دن پہنچا۔ جی چاہا کہ تمہیں تار پھر بھیجوں اس لئے کہ ہر وقت خیال اُدھر لگا رہتا ہے۔ ویسے میں جانتا ہوں کہ آج کل وہاں موسم اتنا گرم اور نا خوشگوار ہوگا کہ محض جیتے رہنا ہی بڑا کارنامہ معلوم ہوتا ہوگا۔ درجۂ حرارت کے اعتبار سے ہمارا شہر قریب اوّل نمبر پر ہے۔ لیکن یہاں کی راتوں سے اس کی کچھ تلافی ہو جاتی ہے۔ یہاں دن میں بھی زیادہ گرمی اس لئے محسوس نہیں ہوتی کہ ہوا چلتی رہتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہوا کے معنی ریت اور گرد و غبار کے بھی ہیں۔ مانو یا نہ مانو میں دن میں چار مرتبہ نہاتا ہوں لیکن پھر بھی چند منٹ کے علاوہ صفائی کا احساس نہیں ہوتا۔

یہ سُن کر خوشی ہوئی کہ تمہارے پاس چند باوفا لوگ ابھی باقی ہیں۔ اپنے آس پاس تو اتنے بھی نہیں۔ جو ہیں وہ دور فاصلوں پر ہیں اور اپنی دوری قائم رکھتے ہیں۔ البتہ کبھی کبھی قطعی اجنبی لوگوں سے دوستی اور خلوص کا کوئی نہ کوئی پیغام یہاں پہنچ جاتا ہے اور اطمینان ہوتا ہے کہ دنیا نے ہمیں بالکل فراموش نہیں کیا۔

تمہارے عورتوں اور بچّوں کے صفحے کے لئے کچھ تجاویز بہت دن ہوئے تمہیں بھیج چکا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ عورتوں کے صفحے میں بلکہ سارے اخبار میں ایک چیز کی کمی ہے اور وہ ہے حقائق اور اعداد و شمار کا عنصر۔ امریکنوں کو اور کچھ بھی کہیں اس ایک کام میں انہیں کمال حاصل ہے اور اس بارے میں اُن سے بہت کچھ سیکھنا چاہئے۔ حقائق سے زیادہ وزنی کوئی دلیل نہیں اور حقائق کے بغیر بہت ہی عالمانہ استدلال بھی کھوکھلا معلوم ہوتا ہے۔ تو میری تجویز یہ ہے، عورتوں کی معاشرتی زندگی کے کسی ایک پہلو کو لے لو۔ مثلاً صحت۔ اس مسئلے کے عام پہلو یہ ہیں۔ صوبے کی کل زنانہ آبادی کے اعداد و شمار۔ یہ مردم شماری کی نئی رپورٹ میں سے مل سکتے ہیں یا گزشتہ رپورٹ

کی بنا پر ان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ پھر یہ دیکھو کہ صوبے میں بیمار عورتوں کے لئے ہسپتالوں میں کل کتنے پلنگ ہیں۔ لیڈی ڈاکٹروں کی تعداد کتنی ہے۔ دائیوں نرسوں اور زیر تربیت طبّی عملے کی تعداد کیا ہے۔ یہ سب اعداد و شمار محکمۂ صحت سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ پھر ان سہولتوں کو کل آبادی پر تقسیم کرو تو غالباً یہ پتہ چلے گا کہ بیس ہزار عورتوں کے حصّے میں ایک پلنگ آتا ہے اور ایک لیڈی ڈاکٹر۔ غالباً اس سے بھی زیادہ تعداد کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ اس کے بعد اُس عام مسئلے کا کوئی خصوصی پہلو لیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ایک دو عام بیماریوں کو لے لو جیسے تپ دق یا زچگی۔ اسی طرح کسی خاص علاقے کا انتخاب کر لو جو اوسط علاقہ قرار دیا جا سکے۔ جیسے لاہور یا آس پاس کے کسی ضلعے کے اعداد و شمار حاصل کر لو۔ تپ دق کے مریضوں کے لئے کتنے ڈاکٹر، نرسیں اور پلنگ موجود ہیں۔ اس کا پتہ آسانی سے چل سکتا ہے۔ مریضوں کی ماہانہ یا سالانہ تعداد بھی دریافت کی جا سکتی ہے۔ پھر یہ دیکھو کہ تپ دق کے ایک مریض کے علاج پر اوسط خرچ کتنا آتا ہے اور ان طبقوں کے گھریلو بجٹ میں جو اس مرض سے سب سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اس خرچ کے لئے کتنی گنجائش نکلتی ہے۔ اسی طرح کارپوریشن کے دفتر سے روزانہ ولادت کے اعداد و شمار مل سکتے ہیں جن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کتنے نومولود اور کتنی زچّائیں طبّی امداد سے محروم رہتی ہیں۔ اسی طریقے سے تعلیم کے مسئلے پر بحث کی جا سکتی ہے۔ ناخواندہ عورتوں کی تعداد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور پھر اس تعداد کا مقابلہ ان نمائشی سرگرمیوں سے کیا جا سکتا ہے جن کا اشتہار اپوا یا اسی قسم کی تنظیمیں دیتی رہتی ہیں۔ لیکن شاید بالغ ناخواندگی کا مسئلہ ایسا اہم نہیں زیادہ اہم مسئلہ یہ ہے کہ تعلیمی سہولتوں کی کمی کی وجہ سے ہم ہر نسل کے کتنے حصّے کو جہالت اور ناخواندگی پر مجبور کرتے ہیں۔ شہر میں بچوں کی کل آبادی کا اندازہ کرو اور پھر شہر کے لڑکیوں کے تمام اسکولوں میں جتنی گنجائش ہے اس سے مقابلہ کرو، غالباً یہی ثابت ہوگا کہ دس فیصدی سے زیادہ بچّوں کے لئے کوئی تعلیمی سہولت موجود نہیں۔ اس کے علاوہ سرکاری مدارس کی حالتِ زار کا بیان بھی کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً بلدیہ لاہور کے پرائمری

اسکول میں جہاں جون کی دھوپ میں بچّیاں بغیر کسی سائے کے تپتے ہوئے فرش پر بیٹھ کر پڑھتی ہیں، اُستانی کی نشست کے لئے چند اینٹوں کا ڈھیر رکھا ہے اور متفرق اخراجات کے لئے صدر معلّمہ کو آٹھ آنے ماہانہ کی شاہانہ رقم ملتی ہے۔ پھر یونیورسٹی سے یہ دریافت کیا جا سکتا ہے کہ ہر سال کتنی لڑکیاں تعلیم سے فارغ ہو کر نکلتی ہیں۔ بی۔ اے پاس کرنے والی لڑکیوں کو ہی لے لو اور یہ دیکھو کہ ان میں سے کتنی لڑکیاں ملازمت حاصل کر سکتی ہیں۔ اور جو دو چار پیشے لڑکیوں کے لئے کھُلے ہیں ان میں ملازمت کی کل گنجائش کتنی ہے۔ غالباً یہی پتہ چلے گا کہ پانچ دس فیصد سے زائد گریجویٹ لڑکیوں کو کسی صورت روزگار میسّر نہیں آسکتا۔ کم تعلیم یافتہ لڑکیوں کا تو ذکر ہی کیا وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک آدمی کا کام نہیں ہے اور ایک دن میں ہو بھی نہیں سکتا لیکن کچھ لوگ مل کر تحقیق کریں تو یہ کچھ ایسی مشکل بات بھی نہیں۔

تمہارے بچّوں کی انجمن کے بارے میں ایک تجویز ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ کسی معقول رہنما کی نگرانی میں ان کے لئے مقامی تعلیمی سیر و تفریح کا پروگرام بنایا جا سکے۔ میری مراد یہ ہے کہ عجائب گھر، چڑیا گھر، مغل عمارتیں، فوج اور فضائیہ کے ادارے، میوہسپتال، انجینئرنگ کالج وغیرہ وغیرہ دکھانے کے لئے اور ہر جگہ کے بارے میں مناسب معلومات بہم پہنچانے کے لئے کوئی پروگرام بنایا جائے۔ غالباً تھوڑی سی بھاگ دوڑ سے کسی سستی سی سواری کا انتظام بھی کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر انتظامات کے لئے کہیں سے امداد مل سکے تو یہ بہت ہی اچھا خیال ثابت ہو سکتا ہے۔ مٹھائی اور آئس کریم وغیرہ شامل کر لو تو اسے کاروباری طریقے سے بھی چلایا جا سکتا ہے۔

یہاں کچھ دن ہوئے ہمارے خاندان میں ایک اضافے کی خوشخبری سُنائی گئی۔ معلوم ہوا کہ ہماری بلّی نے پھر بچّے دیئے ہیں۔ اب کے تین ہیں، دو سفید اور ایک چتکبرا۔ بدقسمتی سے مجھے بلّیاں بالکل پسند نہیں (انسانی ہوں یا حیوانی) لیکن میرے ساتھیوں کو جو اپنی بلیّوں پر جان دیتے ہیں۔ ہماری یہ عدم دلچسپی بہت بُری لگتی ہے۔

۲۵

۲۰ مئی ۱۹۵۲ء

کل تمہاری خیریت دریافت کرنے کے لئے دفتر میں تار بھجوایا ہی تھا کہ تمہارا خط آگیا اس لئے میں نے واپس منگوالیا۔ یہ سُن کر خوشی ہوئی کہ تمہاری طبیعت اب پہلے کے مقابلے میں اچھی اور بہتر ہوگئی ہے۔ اور کوئی تشویش کی بات نہیں ہے۔ میرا ہمیشہ سے کہنا ہے کہ صحت کے معاملے میں ایک پائی کی بچت کرنے سے بیشتر ایک اشرفی کا نقصان ہوتا ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ ہم جیسے غریب لوگوں کو پائی پائی کا حساب رکھنا پڑتا ہے لیکن اسی سبب سے ہمیں اور بھی زیادہ احتیاط کرنی چاہیئے ورنہ اس کفایت کا مقصد فوت ہوجاتا ہے۔ اب ہم تھوڑے بہت نیم حکیم ہو چلے ہیں۔ اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ وٹامن بی کی کمی خوراک میں کس چیز کے نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ ڈاکٹر سلز[1] ر بتا سکیں گے کہ خوراک بالکل متوازن کیسے کرنا چاہیئے۔ لاہور میں چیزیں ضرور گراں ہوں گی۔ لیکن میری کتابوں میں لکھا ہے کہ طبّی طور سے متوازن اور صحت بخش غذا اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہونی چاہیئے جو کہ غریب لوگ عام طور سے کھاتے ہیں۔ میری مراد بالکل مفلس مخلوق سے نہیں۔ انہیں تو کھانے کو کچھ نہیں ملتا۔ مراد مقابلتاً کم خوش حال لوگوں سے ہے۔

اچھّا ہوا کہ لاہور میں گرمی کا کچھ افاقہ ہوگیا لیکن ابھی بدتر موسم کے دن بھی آئیں گے۔ اس لئے جب تم میں سکت نہ رہے تو کچھ دنوں کے لئے پہاڑ پر چلی جانا۔ بہتر یہ ہے کہ جون کے وسط یا اخیر تک انتظار کرو تاکہ واپسی پر برسات شروع ہو چکی ہو۔ اگرچہ ان دنوں میں بھی بعض اوقات موسم کافی ناخوشگوار ہو جاتا ہے۔ لیکن اوّل تو ایسا موسم تھوڑے دنوں کے لئے آتا ہے اور دوسرے سردیوں کی قربت کے خیال سے ہمّت بندھی رہتی ہے۔

ہمارے ہاں تفریح کے سامان قطعی ناپید بھی نہیں چنانچہ اگلے دن ہم نے ایک فلم بھی دیکھی۔ خیر فلم نہ سہی چھوٹی چھوٹی فلموں کا ایک مجموعہ سہی بڈایبٹ[2] اور کاسٹیلو کی مختصر مزاحیہ فلمیں تھیں۔ میں نے جیل سے باہر انہیں کبھی نہیں دیکھا اور نہ غالباً پھر کبھی دیکھنا ہوگا۔

---

[1] لاہور کے ایک ممتاز ڈاکٹر۔ [2] فلم اسٹاروں کی مستقل جوڑی۔

لیکن یہاں یہ فلمیں فن کا حرفِ آخر معلوم ہوتی ہیں۔ کسی مہربان[1] نے یہ فلمیں ادبی بورڈ جیکب آباد جیل میں بھجوایا تھا اور جیل کے حکام نے کمالِ مہربانی سے ہمیں دیکھنے کی اجازت دیدی۔ بہت ہی زوردار تماشہ تھا اور ہم سے وعدہ ہوا کہ پھر بھی دکھایا جائے گا۔

نذیر[2] سے مقدمے بازی کے لئے یہ ہے کہ میرا براہِ راست انہیں لکھنا تو شاید ٹھیک نہ ہو لیکن قاسمی[3] سے کہدو کہ اس معاملے کا تصفیہ ہو سکے تو اچھا ہے اور وہ نذیر سے کہدیں کہ اگر انہیں تصفیہ مطلوب ہو تو شرائط یہ ہیں۔

۱ ۔ پانچواں ایڈیشن جو بلا اجازت چھپا ہے اس کی پوری رائلٹی بیس فیصدی کے حساب سے نقد ادا کی جائے اور کوئی تیسرا شخص مثلاً قاسمی صاحب تعدادِ اشاعت کی تصدیق کریں۔

۲ ۔ کاپی رائٹ کی خلاف ورزی کے لئے دوسو روپے تاوان۔

۳ ۔ مقدمے کا خرچ۔

میرے خیال میں یہ کوئی سخت شرائط نہیں ہیں اور چوتھے ایڈیشن کے بارے میں مجھے کسی مطالبہ کی خواہش نہیں ہے۔ چنانچہ اگر وہ معاملہ ختم کرنا چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ چلتا رہے۔ ہمارا دونوں طرح سے کوئی خاص نقصان نہیں ہے۔

میں نے دوبارہ پرانی رفتار سے لکھنا شروع کر دیا ہے۔ اگرچہ سب چیزیں تمہیں نہیں بھجوا سکتا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ یہ پیسے ہم اپنے سفر خرچ کے لئے بچا رکھتے ہیں جب ہم دنیا کا دورہ کرنے جائیں گے

۳۶

۲۳ مئی ۱۹۵۲ء

تمہارے دو خط ملے۔ ایک آج اور دوسرا ایک دن پہلے۔ دوسرا خط پڑھ کر خاص طور سے خوشی ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ نوجوان حسیناؤں کی صف سے ہمارے مدّاح

---

[1] رئیس بھرگری کی بیگم [2] نقشِ فریادی کے ناشر [3] احمد ندیم قاسمی۔

کب کے رخصت ہو چکے ہوں گے۔ اِن میں تو اپنا چرچا اُس زمانے میں تھا جب ہم شعر میں عاشقانہ رونا دھونا کیا کرتے تھے۔ اگر اُنہیں ہمارا کلام اب بھی پسند ہے تو اس کا مطلب ہے کہ نئی نسل ایسی کم عقل نہیں جیسا کہ ہم سمجھتے تھے اور اُنہیں بالغ زندگی کے وسیع تر اور عمیق تر جذبات کا شعور بھی ہے۔ لیکن اس سے زیادہ اہم اور زیادہ خوش کُن ایک عام آدمی کی رائے ہے جو تم نے بیان کی ہے۔ اس لئے کہ اپنے ذاتی سکونِ خاطر کے علاوہ رائے عامّہ کا تعلق اس حقیقت سے بھی ہے جس سے ہمارا مُستقبل وابستہ ہے۔ اس وقت یہ تعلق شاید دُور کی بات معلوم ہو لیکن دراصل یہ دُور کی بات نہیں، بالکل فوری اور سامنے کی حقیقت ہے اس لئے خاطر جمع رکھو۔

مجھے پورا اتفاق ہے کہ اپنے کام سے کسی صورت جی چُرانا نہیں چاہئے اور کام میں اپنا دل مضبوط رکھنے سے لے کر گھر کی صفائی تک سب کچھ شامل ہے۔ آج کل اِس بارے میں شاید ہم اپنا Poetic Licence کچھ زیادہ استعمال کرنے لگے ہیں۔ لیکن آج کل اپنے پاس اس کا جواز بھی ہے، وہ یہ کہ میں لگاتار لکھ رہا ہوں۔ شاید زیادہ نہیں لکھا جا رہا ہے لیکن نہ لکھنے سے بہر حال بہتر ہے۔ پھر اپنی مرضی یا ارادے سے تو شعر لکھا نہیں جاتا۔ بعض اوقات دو چار مصرعے صاف کرنے میں کئی دن لگ جاتے ہیں اور جب تک سب دماغی کام رُکا رہتا ہے۔ غالباً یہ دقت ہم جیسے دوسرے درجے کے لکھنے والوں ہی کو پیش آتی ہے اس لئے کہ ہمارے "اوزانِ ہنر" ناقص اور ناتسلّی بخش ہیں۔ لیکن خیر۔ احمد راہی کو سویرا کے لئے دو نظمیں بھیجی ہیں۔ عبداللہ ملک سے ان کی نقل منگوا لینا۔ دوبارہ نقل کرنا بہت بور کام ہے۔ دو اور نظمیں[1] تیار ہیں جو ایک آدھ دن میں تمہیں بھیج دوں گا، چنانچہ ہم اتنے بیکار بھی نہیں جتنا کہ تم سمجھتی ہو۔

مقدمے کے احوال یہ ہیں کہ اگلے ہفتے میں کسی دن ہمارے وکلائے صفائی کی باری آئے گی۔ اس لئے غالباً تین ماہ تک یہ قصّہ تمام ہو گا۔ اس سے زیادہ تفصیل میں جانا ممکن

---

[1] "دو عشق" اور ایک اور نظم۔

نہیں۔ اس گرمی میں تمہارے یہاں آنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ بارشیں شروع ہو جائیں اور سفر کچھ زیادہ قابلِ برداشت ہو جائے تو دیکھا جائے گا۔ غالباً یہ عید کے بعد ہی ہو سکے گا۔ لیکن شاید تمہیں عید کے لئے مزید دفتری کام در پیش ہوگا۔ اس لئے جب تک یہ خیال ملتوی رکھو۔ ہاں عید سے خیال آیا کہ ہمارے قومی میلوں اور تہواروں کے سوال پر تم لوگ بحث کیوں نہیں اٹھاتے۔ مغلوں نے یہ کام انتہائی خوبی اور سلیقے سے کیا تھا۔ ان کے طفیل تہواروں کے بارے میں سب معلومات کتبِ تاریخ میں موجود ہیں۔ کرنا صرف یہ ہے کہ پہلے دو تین مرکز چن لئے جائیں جیسے راوی کا کنارا ہے، جہانگیر کا مقبرہ ہے، شاہی قلعہ ہے یا منٹو پارک ہے۔ پھر ہر مرکز کے لئے تفصیلی پروگرام مرتب کیا جائے یعنی قوالیاں، جشنِ موسیقی، پھلوں اور پھولوں کی نمائش، بچوں کے کھیل وغیرہ وغیرہ۔ تفریح کے روایتی اور جدید سامان بہم کئے جائیں۔ لطیف کی تاریخ لاہور سے کافی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ آج کل جب لوگوں کے پیٹ میں کھانے کو نہیں میلوں ٹھیلوں کا ذکر شاید عجیب معلوم ہو لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اسی سبب سے ان کی زندگی میں رنگ و رونق کے کچھ اسباب پیدا کرنا اور بھی ضروری ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہ سب کچھ کرے گا کون تو اس کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔

میں خیر و عافیت سے ہوں۔ یہاں گرمی تو ہے لیکن کچھ ایسی زیادہ نہیں۔ آج ایک مہربان آئے تھے اور بیس نئے پاجامے دے گئے ہیں اس لئے کپڑوں کے بارے میں فی الحال سوچنے کی ضرورت نہیں۔

۳۷

۲۶ مئی ۱۹۵۲ء

تمہارا خط ملا۔ مجھے افسوس ہے میرے گزشتہ خط نے تمہیں انتظار میں رکھا۔ یہ کوئی تعزیری کارروائی نہیں تھی۔ آج کل موسم ہی ایسا ہے کہ ہر طرح کا ذہنی کام مشکل معلوم ہوتا ہے، دن کے بیشتر حصے میں تو یہ احساس بھی نہیں رہتا کہ ہم ذی شعور انسان ہیں۔ دن بالکل خواب کی طرح چڑھتا ہے اور ڈھلتا ہے اور یوں لگتا ہے کہ گرمی بھنگ کا ایک ایسا تند و تیز پیالہ ہے جس نے تن اور ذہن کے باہمی رشتے کاٹ دیئے ہیں اور یہ دونوں اکتاتے

ہوئے لہجے میں ایک مستقل تکرار کرتے رہتے ہیں۔ صرف چھٹی کا دن ایسا آتا ہے جب بہت سویرے کچھ سوچنے کی اور شعوری طور سے کچھ کرنے کی مہلت ملتی ہے، یہ دن نکل جائے تو اگلی تعطیل کا دن آنے تک بے حسی کی زنجیر میں سے کوئی حلقہ ٹوٹنے نہیں پاتا۔ خیر اس میں تھوڑا سا مبالغہ بھی ہے لیکن بنیادی طور سے صورتِ حال یہی ہے۔ لیکن اس اُکتاہٹ اور بے حسی کے عالم میں نہ بے مہریٔ ایام اور اپنے احساسِ زیاں میں کمی واقع ہوتی ہے نہ اپنے امید و ایمان میں فرق آتا ہے پھر کبھی کبھی اپنے پیاروں کی یاد آبشار کی طرح دل پہ گرتی ہے۔ آنے والے دنوں کے تصوّرات اپنی اپنی قوسِ قزح لیکر آتے ہیں۔ اور اس آبشار میں ہزار طرح کے رنگ جھلملانے لگتے ہیں۔

افسردگی کے عالم میں غالباً ہر جگہ زندگی ایسی ہی دکھائی دیتی ہوگی لیکن اپنے سود و زیاں کا حساب اور کیفیت بدلتی رہتی ہے۔ یوں تو سارے جہاں کا درد بہر حال اپنے درد میں شامل رہتا ہے اور زندگی کے ہر لمحے میں اس کا سامنا رہتا ہے لیکن اگر آدمی آزاد ہو تو اس درد کے مقابلے میں خود کو بے دست و پا محسوس نہیں کرتا اور اس کے خلاف بہت آن بان کے ساتھ لڑ بھی سکتا ہے اور اس جنگ میں اپنی ذاتی مسرّت ــــ وہ مسرّت جو محبوب رشتے مہیّا کرتی ہے ــ ہمت اور قوّت بازو مہیّا کرتی ہے۔ چھوڑو ہم نے پھر لکچر شروع کر دیا۔

اپنے پُرانے دوست کی علالت کا سن کر بہت رنج ہوا۔ اُنہیں میرا بہت سا پیار پہنچا دینا اور ان کی صحت کے بارے میں مجھے اطلاع کرتی رہنا۔ غالباً اب تک ان کا مرض تشخیص ہو چکا ہوگا۔ امتیاز[1] (نواب زادہ) آج آئے تھے اور غالباً تمہیں بتائیں گے کہ ہمارے بالوں کے علاوہ جو بہت سرعت سے سفید اور غائب ہو رہے ہیں ہمارا باقی ماندہ وجود ابھی تک صحیح سالم ہے۔ بڑھاپے کا ذکر آیا تو ہمیں یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ آمنہ بہن کا سر ہم سے بھی زیادہ سفید ہو چلا ہے اس لئے یہ کچھ ایسی بات نہیں۔ تمہیں شاید یہ قصّہ میں نے

---

[1] لیاقت علی خاں مرحوم کے رشتے کے بھائی نوابزادہ امتیاز علی خاں

سُنایا تھا کہ گزشتہ بار جب میرا سیالکوٹ جانا ہوا تو ایک پُرانے اسکول کے ہم جماعت سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اس سے کہا چلو ذرا اپنے محلّے کا ایک چکر کر آئیں۔ وہ کہنے لگے "تو پھر بہت سے کھلونے ساتھ لے چلو"۔ پوچھا "وہ کس لئے؟" کہنے لگے "اب وہ سب نانیاں دادیاں ہو گئی ہیں"۔ اماں اور ہماری گانے والی دوستوں کی ملاقات کا حال پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔ برنارڈ شا کے کسی ڈرامے کا سین ہوگا بہت لطف رہا ہوگا۔ اس بارے میں ہمیں کچھ اور لکھو۔ سہروردی[1] لاہور میں ہیں اور آج کل میں آنے والے ہوں گے۔ اگر میرا پیغام مل گیا ہے تو جو کتابیں میں نے مانگی ہیں وہ اِن کے ہاتھ بھجوا دو۔ اُمید ہے کہ سویرا والوں نے میری خرافات کا کچھ معاوضہ تمہیں بھجوا دیا ہوگا۔ تمہارے لئے ایک قمیص کی قیمت تو نکل ہی آئے گی۔

مجھے افسوس ہے کہ تمہارے اخبار کے لئے کچھ اور "خیالاتِ زرّیں" نہیں بھیج سکا۔ جو موضوعات میں نے لکھے تھے وہ فوری طور سے لکھنے کے نہیں تھے۔ مقصد یہ تھا کہ تمہارے رفیق کاران پر کام شروع کر دیں اور کچھ مسالہ جمع ہو جائے تو لکھنا شروع کر دیں جہاں تک افسانوں اور فیچروں کا تعلق ہے تم لوگ مجھ سے بہتر جانتے ہو مثال کے طور پر ایک گھریلو کہانی کا موضوع میں نے تمہیں بتایا تھا یعنی ایک بیگم صاحبہ اپنے ملازموں کو بہت سی باتوں پر ڈانٹتی رہتی ہیں۔ ملازم کھانے کے وقت بغیر اطلاع کے غائب ہو جاتے ہیں۔ کمروں میں روشنی کھلی چھوڑ جاتے ہیں۔ کمروں کی صفائی ٹھیک سے نہیں کرتے وغیرہ وغیرہ اور ہر بار ثابت یہ ہوتا ہے کہ قصور ملازموں کا نہیں بیگم کے شوہر نامدار کا ہے۔ ایسی ہی کہانی اُلٹ کر بھی بیان کی جا سکتی ہے کہ صاحب جس بات پر اپنے ملازموں پر گرجتے ہیں اس میں خطا بیگم صاحبہ کی نکلتی ہے۔ ایک کہانی کسی روزے دار میاں بیوی کے بارے میں بھی بن سکتی ہے جو عام طور سے کھانے پینے کے انتظامات میں ذرا سی بھی دلچسپی نہیں لیتے لیکن رمضان کے آتے ہی صبح سے شام تک سحری افطار کی تفصیلات کے سوا دوسری بات ہی نہیں کرتے۔

---

[1] حسین شہید سہروردی مرحوم جنہوں نے فیضؔ کی وکالت کی۔

۳۸

۲ر جون ۱۹۵۲ء

پچھلے کچھ دنوں سے آندھی، جھکڑ اور وہ طوفان بپا ہے کہ خدا کی پناہ۔ یہ کمبخت جگہ پل بھر میں اتنی ریت اور مٹی ہوا میں بکھیرتی ہے کہ تعجب ہوتا ہے۔ میں غسل خانے میں سے نہا دھو کے نکلتا ہوں تو اپنے کمرے میں پہنچنے تک سارے بال دھول میں اٹ جاتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے ہاتھ پاؤں پر پسی ہوئی چٹان چھڑک دی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ نہانے دھونے کا خیال دل سے نکال دیں اور اپنے سندھی دوستوں کی طرح اسی گرد و غبار میں لوٹتے رہیں لیکن یہ ہو نہیں پاتا چنانچہ میں دن میں کوئی دس بارہ مرتبہ نہاتا ہوں۔ تین چار بار کپڑے بدلتا ہوں اور عود و صندل سے معطّر ہو کر یوں محسوس کرتا ہوں جیسے دنیا کی بادشاہت اپنی ہے اور پھر گرمی اور مٹی اور جیل کی دیواریں۔ لمحہ بھر کے لئے ہم ان سب کو جہنم واصل کر دیتے ہیں اس سے تم لوگوں کی بپتا پہ طنز کرنا مقصود نہیں۔ تم لوگوں پہ کیا بیت رہی ہو گی میں جانتا ہوں۔ لاہور کا درجۂ حرارت اخبار میں دیکھتا ہوں تو دل دکھتا ہے پھر میں تصوّر کرتا ہوں کہ تنور کے سے دفتر میں تمہارا پسینہ بہہ رہا ہو گا۔ بچّے دوپہر کی دھوپ میں پیدل گھر آ رہے ہوں گے اور لمبی تپتی ہوئی شامیں ایک بوجھ کی طرح تن بدن کو کچل رہی ہوں گی۔ مجھے اُن سب تقاضوں کا احساس ہے جو تمہاری اکیلی جان سے کئے جا رہے ہیں۔ جن سے نہ نجات کی کوئی فوری صورت ہے اور نہ آرام جسم و جان کی۔ صرف مشقّت کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے جس کا نہ صلہ ہے نہ معاوضہ۔ میں یہ سب کچھ جانتا ہوں اور تمہاری دلجوئی کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں بجز اس کے کہ ہر سفر کبھی نہ کبھی ختم ہو جاتا ہے اور اگر زندگی باقی ہے تو مستقبل بھی باقی ہے۔

تم نے اخبار میں دیکھ لیا ہو گا کہ استغاثے والے اپنی کتھا بیان کر چکے ہیں اور کل سے ہماری باری ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس دور کا آخری چکّر آ پہنچا اور آگے جو کچھ خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ آج دل اتنا خوش کیوں ہے۔ بالکل ہماری میزو کی طرح جو کبھی کبھی بے وجہ ٹھٹھے لگانے لگتی ہے۔ یہ احمقانہ اور بے وجہ

ہنسی کے دورے ہم دونوں میں مشترک ہیں لیکن اب یہ دورہ مجھے بہت کم پڑتا ہے اور یوں بھی ہماری بزرگی اور بڑھاپے کے شایان شان نہیں ۔

تمہارے آنے کے بارے میں پچھلے خط میں کچھ لکھ چکا ہوں ۔ یہ موسم یقیناً سیر و تماشے کا موسم نہیں ہے ۔ غالباً دو چار ہفتوں کے بعد گرد و غبار بیٹھ جائے گا اور آسمانوں سے آگ برسنا کم ہو جائے گی ۔ شاید طفیل[1] اور سرور[2] جولائی میں آئیں گے ۔ تب طے کریں گے ۔ کوئی ایسی جلدی نہیں ہے ۔ افتی[3] لاہور جاتے ہوئے یہاں رکے تھے ۔ شاید تم سے مل چکے ہوں اب کے وہ پہلے سے کہیں زیادہ پریشان صورت پراگندہ مُو اور مصیبت زدہ نظر آئے ۔ دیکھ کر بہت دُکھ ہوا ۔ انہوں نے اپنی جان کے لئے جو عذاب مول لے رکھے ہیں وہ دو چار دس دن کی بات ہو تو کوئی مضائقہ نہیں، لیکن مستقل طور سے کوئی ایسے بسر نہیں کر سکتا ۔ قطعی ضروری ہے کہ کچھ دنوں کے لئے اب وہ نچلے بیٹھیں اور آرام کریں ۔ رضیہ نے کچھ کتابیں اور بعض پرانے دوستوں کے پیغامات بھجوائے ہیں جن سے ان کی موسیقی کی اور دوسری محفلوں میں ملاقات ہوئی تھی شاید میں نے تمہیں لکھا تھا کہ رشیدہ[4] کے بارے میں محمود[5] کا ایک بہت ہی ملول خط آیا تھا ۔ ایسے مایوس کن لہجے میں لکھا تھا جیسے اب کوئی اُمید باقی نہیں رہی ۔

۳۹

۶ / جون ۱۹۵۲ء

گرمی کی ایک لہر گزر چکی ہے اور پچھلے تین چار دن سے موسم خاصا گوارا ہے ۔ آج کل رات کو چاند نکلتا ہے ۔ جب جیل کی دیواریں محو ہو جاتی ہیں میرے برآمدے کے فرش پر چاندنی کی لہروں میں ریشمی سائے لہراتے ہیں اور درختوں اور ہوا کی سرسراہٹ

[1,2] فیض کے بھائی طفیل احمد خاں اور ان کی بیگم ۔ [3] میاں افتخار الدین مرحوم ۔

[4] ڈاکٹر رشید جہاں، افسانہ نگار اور سماجی کارکن ۔

[5] صاحبزادہ محمود الظفر، رشید جہاں کے شوہر ۔

سے کوہساروں میں بہتے ہوئے ندی نالوں کا نغمہ ذہن میں آتا ہے۔ کل کافی رات گئے میں اپنے بستر پر بیٹھا کشمیر اور شملے کی راتیں یاد کر رہا تھا اور دل کسی صورت یہ ماننے پر راضی نہ تھا کہ یہ جیل خانہ ہے اور جوانی کے دن نہ جانے کب کے بیت چکے۔ غالباً کوئی ایسا ہی خیال اکبر خاں[1] کے دل سے گزرا اور وہ پلنگ پہ آ کے بیٹھ گئے۔

"کیا اس پل زندگی بہت خوبصورت نہیں ہے؟" اکبر خان نے پوچھا۔

"ہاں ہے" میں نے جواب دیا۔

پھر دیر تک ہم دونوں خاموش بیٹھے سگریٹ پیتے رہے۔ یہ حسن جسے زندگی کبھی کبھی بے نقاب کرتی ہے کیسی عشوہ طرازی اور کیسی سیماب صفت چیز ہے اور زندگی اسے آشکار کرنے کے لئے کیسے عجیب و غریب لمحے اور کیسے عجیب و غریب مقامات انتخاب کرتی ہے۔ بعینہٖ ہمارے قدیمی محلوں کی کسی پردہ نشین حسینہ کی طرح۔ اور شاید اسی وجہ سے اس حسن سے لَو لگائے رکھنا اچھا لگتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے گزشتہ بار اپنی نظمیں تمہیں براہ راست نہیں بھیجیں۔ آئندہ ایسا ہی کروں گا ....[2] کے بارے میں تمہاری رائے مجھے معلوم ہے اور مجھے اس سے کچھ زیادہ اختلاف بھی نہیں لیکن ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی بہت سے زاویے ایسے ہوتے ہیں جنہیں پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اُن پر فوری طور سے سفید و سیاہ کا حکم لگا دینا ٹھیک نہیں۔ اِن ہی صاحب کی مثال لے لو۔ وہ جیسے ہیں، ہیں لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ایک زمانے میں بہت سے اچھے لکھنے والوں کو عوام سے روشناس کروانے اور انہیں روزی بہم پہنچانے میں ان کا بہت ہاتھ تھا اور جب ان سے بہتر لوگ تحریک کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ تو یہ اپنے ساتھ رہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس میں ان کا تجارتی مفاد بھی تھا اور بعض اوقات انہوں نے لوگوں کی احتیاج سے فائدہ بھی اٹھایا لیکن یہ تصویر کا ایک رُخ ہے اور اس سے تصویر کے دوسرے رُخ کی نفی نہیں ہوتی۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے حق و ناحق کے Downright فلسفے میں اس طرح کی موشگافیوں کی گنجائش نہیں ہے لیکن

---

[1] سابق میجر جنرل [2] نام ظاہر کرنا مناسب نہیں۔

تمہیں اس نسبتاً کمزور مخلوق کو بھی برداشت کر لینا چاہئے جو ہمیشہ صراطِ مستقیم پر ثابت قدم نہیں رہ سکتی۔

۴۰

۱۴ر جون ۱۹۵۲ء

میں نے کسی خط میں اُن ذہنی رکاوٹوں کا ذکر کیا تھا جن کی وجہ سے آج کل کے موسم میں چھٹی کے دن کے علاوہ خط لکھنا مشکل ہو جاتا ہے اس لئے پھر وہی پرانا پروگرام اختیار کر رہا ہوں۔ علاوہ ازیں اس ہفتے میں قطعی کوئی قابلِ ذکر واقعہ نہیں ہوا (اگرچہ یہاں کوئی بھی واقعہ سنسنی خیز نہیں ہوتا) اب موسم ذرا بہتر ہوا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ گزشتہ چند دن ہم عالمِ خواب میں تھے اور یہ خط لکھنے کے لئے ابھی ابھی سو کر اُٹھے ہیں۔ اسے بھی جیل کی زندگی کے ذہنی سلسلے کی ایک کڑی سمجھ لو۔ شوق و آرزو، فرحت اور سرخوشی، بوریت اور بے حسی اور مکمل ذہنی بیداری کے بعد یکایک ذہنی خلا کے ایسے دن آ جاتے ہیں جن کی کیفیت مہاتما بدھ کے نروان سے ملتی جلتی ہے۔ جب یوں محسوس ہوتا ہے کہ اپنی ہستی مایا کے جال سے چھوٹ چکی ہے اور اپنی ذات روحِ کائنات کے موہوم تانا بانا اور بے شعور وجود میں جذب ہو گئی ہے بدقسمتی سے میرا مزاج صوفیانہ نہیں ہے اس لئے میں اس عالمِ مدہوشی سے زیادہ دیر لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ لیکن کبھی کبھار اس بے خواب۔ خوابناکی کے لمحے آ ہی جاتے ہیں۔

یہ سن کر خوشی ہوئی کہ تمہیں گرمی سے کچھ نجات ملی ہے لیکن ابھی تو تین خوفناک مہینے اور باقی ہیں۔ لیکن سب سے بُرے دن شروع ہی کے دن ہوتے ہیں اور اگر اتنی جلد ان میں افاقے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے تو غنیمت جاننا چاہئے۔

۴۱

۲۱ر جون ۱۹۵۲ء

لاہور کے موسم کی خبروں سے کچھ تشویش رہتی ہے مجھے اُمید ہے کہ تم سب لوگ خیریت سے ہو گے۔ ذرا جلد اطلاع دینا۔ اس موسم میں جب تپتے ہوئے دفتر سے تمہارے بائیسکل پر اپنے گھر آنے کا سوچتا ہوں تو اس خیال سے بچنے کے لئے زور سے آنکھیں میچ

لیتا ہوں۔ اگر تم اتنا لکھ دو کہ ایک آدھ مہینے کے لئے تم نے سائیکل چلانا بند کر دیا ہے تو کچھ اطمینان ہو گا۔ اس میں کچھ خرچ تو بڑھ جائے گا لیکن ایسا بھی کیا خرچ ہو گا۔ وعدہ ہے کہ ہم یہ پیسے پورے کر دیں گے۔ میں صرف جسمانی تکلیف کا نہیں سوچ رہا ہوں اگرچہ وہ بھی اپنی جگہ صبر آزما چیز ہے۔ مجھے زیادہ خیال اس شگفتگی اور خوش مزاجی کا ہے جو اپنے اندر ہوتی ہے اور جسے بہت زیادہ جسمانی سختی چوس لیتی ہے پھر جب کلیجہ جل بھن کر کباب ہو جاتا ہے تو آدمی زندگی کے حسن و خوبی سے لطف اٹھانے کے قابل نہیں رہتا۔ مشکل سے مشکل اور تلخ سے تلخ زندگی میں بھی لطف و انبساط کا کچھ نہ کچھ سامان بہم رہتا ہے جس سے محرومی کسی طرح برداشت نہیں کرنی چاہئے۔ جب کاروبارِ کائنات بہت ہی نامنصفانہ اور غیر معتدل ہو تو کچھ نہ کچھ تلخی تو ضرور محسوس ہو گی لیکن اس تلخی کو اس سرور تحیر پر غالب آنے نہیں دینا چاہئے جو نعمتِ زندگی کی عطا ہیں اور جن کی وساطت سے حسنِ کائنات کے مخفی خزینے بے نقاب ہوتے رہتے ہیں۔

آج کل میں نیتشے کی کتاب Thys spake zarathystra پڑھ رہا ہوں۔ یہ کتاب پہلے میری نظر سے نہیں گزری تھی۔ اگرچہ میں نیتشے کی زیادہ اہم تصنیفات کا مطالعہ کر چکا ہوں۔ اس کتاب میں مسخرہ پن بھی بہت ہے لیکن پیرایۂ تحریر کہیں کہیں انتہائی خوبصورت ہے۔ اگر نیتشے زندہ ہوتا تو جرمنی کے نازیوں سے یقینی لڑتا۔ اس وجہ سے کہ نازیوں نے اس کے فکر و خیال کا حلیہ بگاڑ دیا ہے اور اس کی تحریر کے اصلی خد و خال بالکل مسخ کر دیئے ہیں۔ تھا تو وہ بھی پاجی۔ لیکن بہت حساس اور شاعرانہ قسم کا اس کتاب کے جو حصے مجھے پسند آئے کسی دن تمہیں سناؤں گا۔

۴۲

۳۰ر جون ۱۹۵۲ء

تمہارا خط اور تصویر دیکھ کر اطمینان ہوا۔ اگر یہ کیمرے کا کمال نہیں ہے تو تمہاری صحت بہت بہتر معلوم ہوتی ہے۔

وکیل کا معاملہ پہلے صاف کریں۔ صورتِ حال یہ ہے کہ اس وقت تک انہوں

نے جتنا کام کیا ہے اس کا معاوضہ انہیں مل چکا ہے۔ بہت وافر نہ سہی ایسا ناکافی بھی نہیں تھا یہ ہوئی پہلی بات۔ دوسری بات یہ ہے کہ باقی جو کچھ کرنے کو ہے اس کے لئے ان کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ یہ کام میں خود بھی کر سکتا ہوں ورنہ معاوضے کے بغیر اور لوگ کرنے کو تیار ہیں۔ اگر وہ آنا چاہیں تو بسم اللہ۔ نہ آنا چاہیں تو ان کی خوشی۔

مجھے اُمید ہے تم اپنی عید کے کچھ احوال لکھ کر بھیجو گی۔ ہمارے ہاں کافی پُر تکلف چھوٹی سی پارٹی ہوئی اور نئے باورچی نے اپنے فن کے بہت سے کمالات دکھائے۔ جی چاہا کہ صرف اسی کھانے کی خاطر تم یہاں آجاؤ۔ ہمارے ساتھی ابھی تک ہونٹ چاٹ رہے ہیں۔

میرا ذہنی ٹمپریچر آج کل لاہور کے درجۂ حرارت سے ملا ہوا ہے۔ جب بھی خبر آتی ہے کہ وہاں بارش ہوئی تو دل کو ٹھنڈک پہنچتی ہے۔ جب آندھی یا طوفان کی خبر سنتے ہیں تو دل سے الٰہی خیر کی صدا نکلتی ہے۔ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے اس پر تو کبھی توجہ ہی نہیں جاتی لیکن تمہارے ہاں کے حالات کا مستقل دھڑکا لگا رہتا ہے۔

لاہور سے جو لوگ عید کے لئے آئے تھے اُن سے تمہارے بچّوں کے صفحے اور بچوں کی تقریب کی تعریف سنی جس سے خوشی ہوئی بنےّ اور میں دونوں اس خیال سے کچھ گھبرانے لگے ہیں کہ جیل سے باہر آنے تک ہماری بیویاں ہم سے آگے نہ نکل جائیں۔ کچھ دن ہوئے رضیہ کا ایک خط آیا تھا جو سراسر شعر معلوم ہوتا ہے۔ لکھا تھا "کسی[1] دن جب آنے والی نسلیں تم لوگوں کی باتیں کریں گی تو نہ جانے انہیں کبھی میرا اور ایلس کا بھی خیال آئے گا؟ ہم نے پورا راستہ تمہارا ساتھ دیا ہے۔ تم ایک قدم آگے اور ہم ایک قدم

---

[1] توسین میں رضیہ سجاد ظہیر کے اس خط کا مفہوم دیا گیا ہے جو موصوفہ نے سجّاد ظہیر کو اردو میں لکھا تھا اور توسین کا حصّہ ترجمہ ہے انگریزی کے اس خط کا جو فیضؔ نے ایلس کو بھیجا تھا۔ مطلب دونوں کا ایک ہے البتہ الفاظ میں ضرور فرق ہوگا کیونکہ اس کا اردو سے انگریزی میں اور پھر انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

پیچھے۔ تم مڑ مڑ کر تسلّی کے لئے ہماری طرف دیکھتے رہے اور ہم جواب میں تمہاری طرف مسکراتے رہے۔ اگرچہ ہمارے دل درد سے چلّا رہے تھے۔ کل رات ہم نے مشاعرہ کیا۔ عید کے تحفے کے طور پر چند شعر[1] تمہیں بھیج رہا ہوں۔ کوئی کمال کی چیز نہیں ہے۔ تفریح کا سامان ہی سہی۔

۴۳

۹/ جولائی ۱۹۵۲ء

اب کے لکھنے میں کچھ تاخیر ہو گئی۔ چھٹیوں کے بعد دوبارہ عدالت میں جانے سے کچھ عجب اُکتاہٹ اور بے چینی سی ہوتی ہے جس سے دماغی کام کے روزمرّہ پروگرام میں گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ بہرصورت تمہیں میرا گزشتہ خط مل چکا ہوگا جس کے ساتھ ایک نظم[2] بھی بھیجی تھی (دو[3] اور لکھ چکا ہوں، غالباً ان میں سے ایک ایسی بری نہیں ہے) اس طرح بہت سے ادھورے کام کا بقیہ جس کا بوجھ ذہن پر تھا صاف ہو چکا ہے کچھ نامکمّل نظمیں تھیں کچھ متفرق اشعار تھے یہ سب مکمّل ہو چکے اور اب کوئی نئی چیز شروع کرنے کا ارادہ ہے لیکن اس طرح کی تحریروں سے اپنی تسلّی نہیں ہوتی۔ بلیشتر اوقات صرف مایوسی اور آزردگی کا احساس ہوتا ہے اور جو بھی لکھا ہو بہت معمولی اور سطحی معلوم ہوتا ہے۔ ماضی میں ایسا نہیں تھا۔ اُن دنوں ہم دل سے بہت مجبور ہو کر کبھی کبھار کچھ لکھتے تھے اور یہ اکثر کھرا مال ہوتا تھا۔ لیکن اپنے پر جبر کر کے مشق کے طور سے لکھنا بالکل دوسری چیز ہے۔ اس میں جذبۂ دل کبھی ساتھ دیتا ہے کبھی نہیں دیتا۔ خیر اس میں یہ فائدہ تو ہے کہ کچھ نہ کچھ لکھا جاتا ہے اور بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہنا بہرطور بہتر ہے کچھ نہ لکھنے سے۔ لیکن میں اس بات کا زیادہ قائل

---

[1] کہو تو ہم بھی چلیں، فیضؔ اب نہیں سردار۔ وہ فرق مرتبۂ خاص و عام کہتے ہیں۔

[2] رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام

[3] گرانیٔ شبِ ہجراں دوچند کیا کرتے۔ اور۔ فکر دلداریٔ گلزار کروں یا نہ کروں۔

نہیں ہوں میں بہت دنوں سے سوچ رہا ہوں کہ کیوں نہ پنجابی میں لکھنا شروع کر دوں اور دیکھوں کہ اپنی مادری زبان میں کیسا لکھا جاتا ہے ۔ اُردو ایسی مرصع زبان ہے کہ کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا اِسے اپنے عوام تک پہنچانے کے لئے کس ڈھب سے لکھیں ۔ مجھے معلوم ہے کہ تم جیسے پنجابی کے مخالف اس پر برہم ہوں گے لیکن زبان کے بارے میں تنگ نظری اور تعصّب بہت غیر معقول بات ہے ۔

تمہارا عید نمبر پڑھا تھا ۔ غالباً اس کی داد بھی بھیج چکا ہوں ۔ یہاں موسم کچھ ایسا بُرا نہیں ہے ۔ دن میں گرد و غبار تو رہتا ہے لیکن گرمی زیادہ نہیں اور راتیں کافی خوشگوار ہوتی ہیں ۔ ہم خیر و عافیت سے ہیں اور باقی معاملات ایسے ہی چل رہے ہیں جیسے توقع تھی جیسے پہلے بھی لکھ چکا ہوں بہت یقین سے کسی بات کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے لیکن غالباً اب زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا ۔ اپنا جی بھی چاہتا ہے کہ یہاں سے نکلنے کے بعد یونیورسٹی میں کوئی جگہ مل جائے لیکن ہمیں دے گا کون ؟ خیر خسارہ اُن ہی کا ہے ۔

۴۴

۱۶ ر جولائی ۱۹۵۲ء

میں گزشتہ دونوں اتوار مُسلسل لکھنے میں مصروف تھا ۔ یہ سلسلہ بیچ میں توڑنے کو جی نہ چاہا ۔ بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ خیال کا سلسلہ بیچ میں ٹوٹ جائے تو پھر ٹوٹی ہوئی کڑیاں دوبارہ جوڑنے میں بہت دِقّت پیش آتی ہے ۔ اس ہفتے میں نے ایران اور مصر کے شہید طلبہ پر ایک نظم شروع کی ہے ۔ جیل میں آنے کے بعد پہلی دفعہ اپنی کسی تخلیق سے کچھ اطمینان ہوا ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اظہار کی جس ہیئت اور پیرائے کی تلاش تھی اس نظم میں پہلی بار ہاتھ آئے ہیں ۔ یہ بالکل خلاف روایت انداز ہے جس سے پُرانے اساتذۂ فن ضرور خفا ہوں گے لیکن اس کی پرواہ کون کرتا ہے ۔ اُمید ہے کہ اگلے ہفتے تک مکمل کر کے تمہیں بھیج سکوں گا ۔ صوفی صاحب سے فرمائش کرنا کہ اگر انہیں پسند ہو تو اس کا فارسی میں ترجمہ کر دیں ۔ تمہارا جی چاہے تو ان کی مدد سے انگریزی میں بھی ترجمہ ہو سکتا ہے ۔

تمہارے آنے کے بارے میں یہ ہے کہ اگر بچے ساتھ آسکتے ہیں تو تھوڑی دیر اور انتظار

کرلو۔ اس پر جو زائد خرچ ہوگا وہ قطعی جائز ہے اور یوں بھی جیسے میں نے کئی بار کہا ہے تھوڑی سی فضول خرچی روحانی آسائش کے لئے بہت اچھی چیز ہے۔ غالباً یکم یا دو دسمبر کو عید پڑے گی اگر سفر ملتوی ہی کرنا ہے تو بہتر یہ ہے کہ اُسی دن آؤ تاکہ ہم پورا دن ساتھ گزار سکیں۔ میزو کی سالگرہ کا بھی ایسا ہی اہم دن ہے اس لئے اس سے بھی مشورہ کرنا ہوگا۔ لیکن غالباً دونوں تقریبیں یک جا نہیں ہو سکتیں۔ بہرحال تم اگر عید کے دن آؤ تو ہم یہ وعدہ کر سکتے ہیں کہ تمہیں ایسا کھانا کھلائیں گے جو تم نے عرصے سے نہیں کھایا ہوگا۔ سفر خرچ کے لئے کتاب کا مسوّدہ تمہیں بھیجدوں گا لیکن اگر یہ وقت پر نہ بھی پہنچے تو اس آمدنی کی اُمید پر اپنی گرہ میں سے خرچ کر لینا۔

عنایتؔ[1] کے ہاں پھر بیٹی ہوئی ہے۔ اس خبر سے ہنسی آئی۔ ہماری اماں کا اپنی سب بہوؤں سے ناک میں دم آچکا ہوگا۔ ہر ایک نے ولادتوں کے بارے میں ایک ہی جیسا معقول رویّہ اختیار کر رکھا ہے اتنی بہت سی پوتیاں ہوگئی ہیں اور پوتا ایک بھی نہیں۔ ساسوں کا ذکر آیا تو ہمارے جس دوست کی بیوی کے بارے میں تم نے پوچھا ہے[2] ان کا مسئلہ وہی ہے جو اور ہزاروں لاکھوں کا ہے یعنی جائداد اور روپے پیسے کے جھگڑے۔ جب تک ذاتی ملکیت کا موجودہ نظام قائم ہے۔ اس مسئلے کا کوئی قطعی حل تو پیدا نہیں ہو سکتا۔ البتہ ہر ذاتی مسئلے کی طرح اس سے نپٹنے کی صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی اس سے بلند و بے نیاز ہو جائے اور دوسرے یہ کہ آدمی اس کے نیچے دب کر رہ جائے دوسری صورت کچھ ایسی سود مند نہیں اسلئے پہلی ہی صورت کا کوئی نسخہ برتنا چاہئے اس کی خاطر ظاہر داری، مصلحت کوشی، لجاجت، تغافل جو کچھ بھی کرنا پڑے ٹھیک ہے تاکہ اپنے اور دوسروں کے رنج و ناخوشی میں کچھ کمی ہو سکے، یہ کوئی سیدھا اور بندھا ہوا نسخہ نہیں ہے۔ جس کسی سے جیسے بھی بن پڑے ویسے کرے۔ شرط صرف یہ ہے کہ آدمی اپنی ساری توجہ زیادہ بار آور زیادہ بامعنی اور زیادہ اہم چیزوں پر مرکوز رکھے جو ایک طرح سے زیادہ تکلیف دہ اور صبر آزما راستہ ہے لیکن اس کے علاوہ کوئی اور

---

[1] فیضؔ کے چھوٹے بھائی عنایت احمد خاں [2] نام ظاہر کرنا مناسب نہیں ہے۔

راستہ موجود ہی نہیں۔

کچھ دن ہوئے آمنہ[1] کتابوں اور سگریٹوں کا ایک پورا انبار ساتھ لائی تھیں مجھے اس طرح کی نیکی کا شکریہ ادا کرنے کا بالکل ڈھنگ نہیں آتا۔ ان کی مالی حالت مجھے معلوم ہے اور ان چیزوں کی لاگت کا اندازہ کرتا ہوں تو پریشانی ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ کبھی نہ کبھی اس کا بدلہ چکا دیں گے لیکن یوں ہوتا نہیں ہے اس لئے نہیں ہوتا کہ زندگی میں ایک ہی جیسے موقعے بار بار نہیں آتے۔

یہ سن کر افسوس ہوا کہ تمہارے ابا پھر علیل ہیں۔ اگلے سال ہم یقیناً ان سے ملنے جائیں گے۔ یوں بھی آئندہ سال انگلستان جانے کے لئے مناسب ہے جب ہم ملکہ کی تاجپوشی بھی دیکھ سکیں گے اور ملکہ معظمہ سے درخواست کریں گے کہ ہمیں بیرونیٹ (لارڈ وغیرہ) بنا دیا جائے اور ہمارے نام ایک جاگیر لکھ دی جائے جہاں ہم زندگی کے باقی ایام عُلیا حضرت کی مدح و ثناء میں گزار سکیں۔

۴۵

۱۷ر جولائی ۱۹۵۲ء

کل رات تمہیں خط لکھا تھا۔ غالباً ابھی بھجوایا نہیں گیا۔

آج صبح میرے[2] بھائی کی جگہ موت میری ملاقات کو آئی۔ سب لوگ بہت مہربانی سے پیش آئے۔ یہ لوگ میری زندگی کی عزیز ترین متاع۔ مجھے دکھانے لے گئے۔ وہ متاع جو اب خاک ہو چکی ہے اور پھر وہ اسے اپنے ساتھ لے گئے۔

---

[1] بیگم مجید ملک۔

[2] روداد قفس مندرجہ زنداں نامہ کے مطابق فیض کے بڑے بھائی طفیل احمد خاں "حیدرآباد (فیض) سے ملنے آئے تھے اور اپنے ایک روحانی پیشوا کی طرف سے ان کی رہائی کی خوشخبری لائے تھے۔ ابھی حیدرآباد میں ہی تھے کہ ۱۷ر جولائی ۱۹۵۲ء کی صبح کو نماز پڑھتے ہوئے اس دنیا سے رحلت کر گئے۔"

میں نے اپنے غم کے غرور میں سر اونچا رکھا اور کسی کے سامنے نظر نہیں جھکائی۔ یہ کتنا مشکل کتنا اذیت ناک تھا صرف میرا دل جانتا ہے۔

اب میں اپنی کوٹھڑی میں اپنے غم کے ساتھ تنہا ہوں۔ اب مجھے سر اونچا رکھنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں اس غم کے بے پناہ ظلم سے ہار مان لینے میں کوئی تذلیل نہیں ہے۔

میں اس کے بیوی بچوں اور اپنی اماں کے خیال کو دل سے ہٹانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ابھی انہیں کچھ لکھنے کی سکت بھی نہیں ہے۔ لکھ ہی کیا سکتا ہوں۔ میں نے اپنی ماں کی پہلی اولاد اُن سے چھین لی ہے۔ ہاں میں نے ہی سب کو اس کی زندگی سے محروم کر دیا ہے۔

اس وقت حواس اتنے پراگندہ ہیں کہ زیادہ نہیں لکھ سکتا۔ لیکن آپ لوگ میرے بارے میں فکرمند نہ ہوں یہ زخم بہت اچانک بہت بے سبب لگا ہے لیکن اسے سہنے کا بل مجھ میں ہے اور اس کے سامنے بھی میرا سر نہیں جھکے گا۔ صرف یہ جی چاہتا ہے کہ اس وقت میں باہر ہوتا اور اُن بیچاروں کو اپنے بازوؤں کا سہارا دے سکتا جن کے تن مجھ سے زیادہ کم طاقت اور جن کا دکھ میرے غم سے زیادہ بھاری ہے۔

۴۶

۲۱؍ جولائی ۱۹۵۲ء

تمہیں یہاں آنے میں تکلیف تو بہت ہوئی ہوگی لیکن بہت اچھا ہوا کہ تم آگئیں۔ بہت سی باتوں کے بارے میں دل بہت پریشان تھا اور تمہارے آنے کے بعد کچھ تشفی ہو گئی اب بھی کبھی کبھی جب خیال آتا ہے کہ طفیل کو پھر کبھی نہیں دیکھ سکیں گے تو دماغ سن سا ہو جاتا ہے اور دل یہ بات ماننے پر کسی طور تیار نہیں ہوتا لیکن اب اس درد میں ہر وقت پہلے کی طرح ٹیسیں نہیں اٹھتیں اور دل کے مجموعۂ درد میں یہ درد بھی کہیں جذب ہو گیا ہے یہ تو میں جانتا ہوں کہ عمر بھر وقتاً فوقتاً یہ درد پہلو میں بیدار ہوتا رہے گا۔ لیکن انسانی تعلقات کا نظام یوں ہی چلتا ہے اور آدمی اس کے ساتھ دن بسر کرنا جلد سیکھ لیتا ہے۔ وہاں[1] کی صورت حال سے مجھے

---

[1] طفیل مرحوم کے گھر کی صورتِ حال۔

اطلاع دیتی رہنا۔ میں کسی بات میں امداد تو نہیں کرسکتا ہوں لیکن تم لوگوں کی تکالیف میں شرکت کرکے ذہنی طور ہی سے سہی کم از کم یہ تو احساس ہوتا ہے کہ ہم بالکل بے تعلق اور ناکارہ نہیں ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس مشترکہ مشکل میں تم بھی کچھ زیادہ نہیں کرسکتی ہو اس لیۓ کہ تم پر اپنا بوجھ بہت ہے لیکن انسانی خوشی میں جو تھوڑا بہت اضافہ اپنی شفقت یا ہمدردی کرسکتی ہے اس کی اہمیت کم نہ سمجھنا چاہیۓ۔ خواہ اس کی قدر ہو یا نہ ہو اور کوئی اس کا اعتراف کرے یا نہ کرے۔

ایرانی طلبہ پر نظم[1] اور یہ نوحہ[2] لکھا تھا بھیجتا ہوں۔ یہاں ایک دوست[3] نے اس نوحہ کے جواب میں جو اشعار لکھے تھے وہ بھی ملفوف ہیں۔

۴۷

۹ اگست ۱۹۵۲ء

اب تک تمہیں میرا مسودہ پہنچ گیا ہوگا۔ یہ بالکل مکمل نہیں ہے اس لیۓ کہ ابھی دو تین چیزیں باقی ہیں جو غالباً اگلے ہفتے تک مکمل ہو جائیں گی اور جب تک یہ سب کچھ اشاعت کے لیۓ تیار ہوگا ممکن ہے کچھ اور بھی بھیج سکوں۔ مجھے افسوس ہے کہ مظہر[4] کے لیۓ ابھی تک کچھ نہیں لکھ سکا یہاں حوالے کے لیۓ کتابیں دستیاب نہیں ہیں اور ذہن پر بوجھ اتنا ہے کہ دل لگا کر کوئی ٹھوس چیز لکھنا مشکل ہے۔ ذہن جب بھی ذرا فارغ ہوتا ہے۔ میں شاعری میں لگا دیتا ہوں جو میرا اصلی کام ہے اور اب لکھنے میں کچھ سہولت بھی محسوس ہونے لگی ہے۔ اب بھی ہر ولادت درد سے بالکل خالی تو نہیں ہوتی لیکن یہ عمل پہلے جیسا طویل اور اتنا تکلیف دہ نہیں ہوتا۔ خرابی یہ ہے کہ Bloody Perfecnonisia کے طعنوں سے تنگ آکر اب میں نے پہلے کی طرح الفاظ کو بنانے سجانے اور تراش خراش کا کام چھوڑ دیا ہے۔ اس لیۓ کبھی پوری طرح اطمینان نہیں نہیں ہوتا کہ جو کچھ لکھا ہے وہ ٹھیک بھی ہے کہ نہیں یہاں کوئی ایسا نکتہ چیں بھی نہیں جو امداد

---

[1] ایرانی طلبہ کے نام۔ یہ کون سخی ہیں جن کے لہو کی اشرفیاں چھن چھن چھن چھن۔ [2] مجھ کو شکوہ ہے مرے بھائی کے تم جاتے ہوئے۔ [3] سجاد ظہیر۔ ظلم کے بچۂ منحوس نے بڑھتے بڑھتے۔ شجرِ زیست سے اک اور ثمر توڑ لیا۔
[4] مظہر علی خاں مدیر پاکستان ٹائمز۔

کر سکے اس لئے ہمارے اُستاد[1] سے کہنا کہ ہر چیز کو ذرا احتیاط سے دیکھ لیا کریں۔

رشیدہ[2] کے ماسکو میں مرنے کی خبر کل پڑھی۔ اگر میں جیل سے باہر ہوتا تو شاید زار و قطار روتا لیکن اب تو رونے کو آنسو ہی باقی نہیں رہے۔ اس حادثے کا سن کر رونے دھونے کے بجائے دل پر عجیب مُردنی سی چھائی رہی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اب کے موت رات کے رہزن کی طرح اچانک اور بے اطلاع نہیں آئی تھی یا شاید اپنے لاشعور میں یہ خیال بھی ہو کہ مرنے والی کی بہادر روح بیکار اور بزدلانہ غم و اندوہ کو پسند نہیں کرے گی۔ جب سے اس کی مہلک بیماری کا سنا تھا دل میں بہت شدّت سے تمنّا تھی کہ کاش وہ ہمارے باہر آنے تک زندہ رہے اور ہم سب ساتھ اس سے ملنے کے لئے جا سکیں۔ اُسے بچوں سے بہت پیار تھا۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ ہمارے بچوں کو دیکھے گی تو کتنا خوش ہو گی۔ افسوس کہ موت کے خلاف اس کی طویل جنگ اتنی جلد ختم ہو گئی۔ اس کے جانے سے ہمارے برّصغیر سے نیکی اور انسان دوستی کی بہت بڑی دولت چھن گئی اور اس کے دوستوں کی محرومی کا کیا کہئے جن کی زندگیاں اس کے ایثار و مروّت سے اس قدر آسودہ اور مزیّن ہوئیں۔

۴۸

۱۴ اگست ۱۹۵۲ء

تمہارے خط سے خاندانی معاملات کے بارے میں کچھ تسکین ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم مالی طور سے طفیل کے بچّوں کا مستقبل محفوظ ہے۔ لیکن امّاں کے بارے میں مجھے پورا اطمینان نہیں ہے۔ اس وقت تو اچھا ہے کہ وہ سرور کے گھر میں بچّوں کے پاس رہیں۔ اور کام کاج میں اُنکا دھیان بٹا رہے۔ جیسے تم نے لکھا ہے کہ ان کی محبت اور خودداری کا تقاضہ بھی یہی ہے لیکن تشویش اس وجہ سے ہے کہ کوئی بے خیالی میں ایسی بات نہ کہہ بیٹھے جس سے ان کی خودداری کو ٹھیس پہنچے۔ تمہیں حالات بہتر معلوم ہیں اگر مناسب سمجھو تو ان سے کہدو کہ ہمارا گھر بھی اُن کا اپنا ہے اور وہ جب چاہیں یہاں واپس آسکتی ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ نہیں آئیں گی۔ لیکن

---

[1] صوفی غلام مصطفےٰ تبسّم [2] ڈاکٹر رشید جہاں۔

کم از کم انہیں یہ بھروسہ ہونا چاہئے کہ ان کی پذیرائی کے لئے ایک سے زیادہ گھر موجود ہیں اور جہاں بھی وہ رہیں ان کی اپنی خوشی اور مرضی کی بات ہے اس میں کسی مجبوری یا احتیاط کو دخل نہیں۔

آج تمہارا دوسرا خط ملا۔ گزشتہ چند دن پھر افسردگی کا ہلکا سا دورہ پڑا تھا جس سے آج افاقہ ہے غالباً موسم کی وجہ سے۔ آج کل یہاں گرمیوں کے بجائے بہار کا سا موسم ہے۔ صبحوں میں کچھ ایسی موہوم سی ٹھنڈک اور بے چینی ہے جیسے بہار نے پہلا سانس لیا ہو، معلوم ہوتا ہے کہ دھوپ میں گرمی کے بجائے صرف رنگ ہی رنگ ہے شام کی ہوا سے سمندروں کی باس آتی ہے اور یوں لگتا ہے کہ آسمان جیل کی بے رنگ دیواروں کے بجائے دور دراز ساحلوں پر ناریل کی قطاروں پر غروب ہو رہا ہے اور یہ سب بہت غمناک ہے۔ ہر اس حُسن کی طرح غمناک جو نظر میں ہو مگر بس میں نہ ہو۔ ہر اس حُسن کی طرح جو معلوم ہو کہ محض سراب یا نظر کا دھوکا ہے۔

۱۵؍ اگست:۔ کل یہاں کے منظر میں ایک انقلاب دیکھنے میں آیا۔ جیل کے دروازے پر سرخ، سبز اور نیلی بتیوں کی لڑیاں روشن ہوئیں اور چار لاؤڈ اسپیکروں نے اپنی پھٹی ہوئی اور بے سُری آوازوں میں ریڈیو نغمے نشر کئے۔ رنگ اور بتیاں اور شور و غل یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہم حیدرآباد جیل میں نہیں ہیں انارکلی بازار میں ہیں۔ صبح آنکھ کھلی تو دل میں عجیب طرح کی خوشی محسوس ہوئی[۱] اور میں نے اسی وقت بیٹھ کے لکھنا شروع کیا جو اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ مجھے انتہائی تعجب ہوا کہ لکھنے میں کچھ وقت ہی نہ لگا اور ناشتے کے وقت تک میں اسے قریب قریب ختم کر چکا تھا۔ ابھی تک اس کا نشہ موجود ہے اور اور کچھ خدشہ محسوس ہو رہا ہے کہ شاید ہم واقعی کسی دن شاعر ہو جائیں۔

تمہارا یوم آزادی نمبر بہت اچھا ہے۔ میں نے اسے بہت ناقدانہ نظر سے دیکھا لیکن اصلاح کی کوئی گنجائش نظر نہیں آئی۔ منظر کا اداریہ بہت اچھا تھا۔ انور کا کارٹون بھی اور برطانیہ میں پاکستانی حکومت والا طنزیہ مضمون بھی۔

---

[۱] نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں۔

میں بہت سنجیدگی سے سوچ رہا ہوں کہ تمہاری ینگ ریڈرز لیگ میں شامل ہو جاؤں تاکہ ہمیں بھی کچھ قلمی دوست میسر آسکیں۔ یہاں بعض ساتھیوں کی ڈاک اتنی آتی ہے کہ رشک آنے لگا ہے۔

۴۹

۲۳ راگست ۱۹۵۲ء

تمہارا ایک خط تین دن پہلے ملا تھا۔ ایک کل آیا۔ بچوں کے خطوط اور تصویریں بھی ملیں اس لیے دل بے حد خوش ہے۔ لڑکیاں بڑی ہو گئی ہیں ان کی صورتیں دیکھ کر خواہ مخواہ مسکرانے کو جی چاہتا ہے۔ میرا مسودہ تمہیں مل گیا ہوگا۔ لیکن نہیں بھی ملا تو تم اب آجاؤ۔ سفر پہ جو بھی خرچ ہوگا بعد میں منہا کر لینا۔ اور عید پہ ظاہر ہے سب لوگ اچھے کپڑے پہنیں گے اس لئے تم بھی اپنا لباسِ فاخرہ ساتھ لے آؤ۔

امتیاز اور بنّے کے بھائی آئے تھے اور چونکہ امتیاز نے مجھ سے بھی ملنے کی درخواست دے رکھی تھی اس لیے ہم سب کی ایک ساتھ ملاقات ہوئی۔ بہت لطف رہا۔ بنّے کے بھائی حسین ظہیر نے ہم سب کو حیدرآباد دکن آنے کی دعوت دی۔ اس لیے ہمارے سفر کے پروگرام میں یہ شہر بھی شامل کر لو۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں آدھی دنیا کا دورہ کرنا پڑے گا۔ اس لئے کہ ایک دعوت دہلی سے بھی آئی رکھی ہے۔ یہ حمیدہ[1] سلطان کی جانب سے ہے انہوں نے فرمائش کی ہے کہ ہم دلّی کی یاد میں ایک نظم لکھ دیں۔ وہ دلّی نہیں جو آج کل ہے بلکہ وہ دہلی جو کہ اب سے پہلے تھی۔ اور جس سے ہم آشنا تھے شاید کبھی لکھی جاسکے۔

اگر تمہیں میری آخری نظم مل چکی ہے تو غالباً تم نے مسودے میں شامل کر لی ہوگی۔ دو اور تیار ہیں جب تم آؤ گی تو ساتھ لے جانا۔ یہ دونوں کچھ طویل نظمیں نہیں ہیں اور ان سے کتاب کا مجوزہ نقشہ مکمل ہو جانا چاہیئے۔ اگرچہ مجھے یقین ہے کہ کتاب کی اشاعت تک کچھ اور چیزیں بھی ہو جائیں گی۔ آج کل میں ابتدا سے اب تک کی اردو شاعری کے انتخاب پر

---

[1] انجمن ترقی اردو دہلی کی منتظم اور نواب مشتاق احمد خاں گرمانی کی خواہر نسبتی۔

کام کر رہا ہوں۔ ہر روز دو تین گھنٹے اس میں صرف ہوتے ہیں لیکن کام بہت لمبا ہے۔ اس کے لئے کئی مہینے درکار ہوں گے۔ اگر ختم کر سکا تو قابلِ ذکر چیز ہو گی۔ جیل خانے میں تو شاید ختم نہ ہو سکے لیکن اگر کم دلچسپ حصّہ یہاں نبٹ جائے تو شاید بعد میں یہ کام خود بخود رواں رہے۔

امروز میں موسیقی پہ رفیق غزنوی کا مضمون اس موضوع پر شاید بہترین تحریر ہے۔ اگرچہ مجھے کچھ چھوٹے موٹے نکات سے اختلاف ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر کسی ناشر میں سمجھ بوجھ ہو تو کچھ دوسرے اساتذہ کے تبصرے کے ساتھ اسے کتابچے کی صورت میں الگ شائع ہونا چاہیئے۔ ویسے میں جانتا ہوں کہ یہ کوئی بھی نہیں کرے گا۔

۵۰

۱۵ ستمبر ۱۹۵۲ء

تمہاری موجودگی اور بچوں کی ہنسی کا کچھ کچھ تاثر ابھی تک فضا میں باقی ہے اور باعث تسکین۔ تمہارے جانے کے بعد کہنے کی بہت سی باتیں یاد آئیں جو کہہ نہیں سکے اس لئے کہ گفتگو کا وقت مقرر ہو تو ٹھیک سے گفتگو ہو نہیں پاتی مقررہ وقت کے خاتمے کا خیال ذہن پر اتنا چھایا رہتا ہے کہ جو تھوڑا سا وقت میسّر ہو وہ بھی ٹھیک سے استعمال نہیں ہو سکتا۔ خیر مجبوری ہے کسی دن تو یہ دیواریں گر جائیں گی اور تن و دماغ کی آزادی دوبارہ ہاتھ آجائے گی جب تک اس کے سوا چارہ نہیں کہ انتظار کریں اور اس خیال سے تسکین حاصل کرتے رہیں کہ اپنے جسم و تن سلامت ہیں اور اپنی رگوں میں زندگی کی جو لہر رواں ہے آخر ایک دن طوق و سلاسل کے انبار پر غالب آجائے گی یہ زنجیریں کیسی ہی قوی اور گراں کیوں نہ ہوں بہرصورت مُردہ اور بے جان چیزیں ہیں۔

تمہارے جانے کے بعد میں نے کوئی کام نہیں کیا اور دن خواب آلود یادوں میں گزرتے رہے آج فیصلہ کیا ہے کہ اپنے آپ کو جھنجھوڑیں اور پھر سے کام شروع کر دیں اگرچہ ہم یہاں جو کچھ کرتے ہیں۔ یعنی کچھ پڑھ لیا کچھ لکھ لیا کچھ سوچ لیا۔ اس کے لئے کام کا لفظ کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ جیل میں بیشتر وقت کام میں نہیں کام کی آرزو میں گزرتا ہے۔ ایسا ٹھوس، محنت طلب اور دِقت طلب کام جس کی تکمیل میں جان و تن کی سب طنابیں کھنچنے

لگیں اور ذہن کے رگ و ریشے چور ہو کر دُکھنے لگیں۔ جیل میں ایسا کوئی کام نہیں ہو سکتا اس کا ارادہ تو کئی بار کیا ہے۔ کوشش بھی کی ہے لیکن دماغ اتنا سرکش ہو گیا ہے کہ ماننے نہیں مانتا۔ پھر بھی یہاں سب سے زیادہ اسی چیز کی ہوس ذہن پر مسلّط رہتی ہے کہ دوبارہ کسی کام سے لگیں۔ کوئی ایسا کام جو مفید بھی ہو اور تسلّی بخش بھی۔

ابھی ابھی میں نے وہ ناول ختم کیا ہے جس پر گزشتہ برس نوبل انعام دیا گیا تھا اس کا عنوان ہے Macisterlydi بہت طویل، تھکا دینے والی شیطان کی آنت تمثیل ہے جس کے صرف چند ٹکڑے کچھ اچھے ہیں۔ اگر نوبل انعام کا معیار یہی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اگر کوشش کریں تو ہم یہ انعام حاصل نہ کر سکیں۔ اب ایک نظم جو بہت دنوں سے رُکی ہوئی ہے نپٹانے کی کوشش کروں گا اور ایک آدھ دن کے بعد کچھ تعارفی جملوں کے ہمراہ جو رؤف کو درکار ہیں بھجوا دوں گا۔

۵۱

۱۷ ستمبر ۱۹۵۲ء

دنوں کی گنتی یاد نہیں رہی اس لئے شاید اس خط کے لئے تمہیں کچھ انتظار کرنا پڑا ہو اس کا عُذر خط کے ساتھ منسلک ہے اور رؤف کے لئے پیش لفظ بھی۔ یہی وہ نظم[۲] ہے جس کا میں نے وعدہ کیا تھا اُسے کہلوا دو کہ اب کتاب مکمل ہے۔ ایک مطبوعہ نظم جو اس میں شامل نہیں ہے وہ خود حاصل کر سکتے ہیں اور اس کے بعد طباعت شروع ہو سکتی ہے۔ مسوّدے پر اب تک نظرِ ثانی بھی ہو چکی ہو گی۔ اور اگر اس سلسلے میں صوفی صاحب کی کوئی تجاویز ہوں تو مجھے بھجوا دیں۔

بہت دنوں کے بعد تمہارے خط میں کچھ خوش دلی کی جھلک نظر آئی جس سے خوشی ہوئی لیکن اماں کے بارے میں دل بہت پریشان ہے۔ میں انہیں خط لکھ رہا ہوں لیکن اس سے

---

[۱] مصنف سوئٹزرلینڈ کا ادیب ہرمن ہیس ہے۔

[۲] شورشِ بربط و نے۔

کیا حاصل ہوگا جب تک میں خود وہاں نہیں ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ غم و آلام کے ہجوم میں کہیں اُن کی ہمت جواب نہ دے جائے۔ کتنی ظالمانہ بات ہے کہ تن تنہا ہمیں پالنے پوسنے اور کسی قابل بنانے کے لئے عمر بھر کی طویل اور کڑی جد و جہد کے بعد اب اس عمر میں انہیں پھر ویسی ہی تنگ دستی اور محرومی کا سامنا ہے جو اس جد و جہد کے آغاز میں تھا۔ اور بہت سے جانکاہ صدمے اس کے علاوہ لیکن میں جانتا ہوں کہ یہاں اپنے بس میں کچھ بھی نہیں ہے اس لئے اس احساس کو اس وقت تک اٹھا رکھنے کی کوشش کرتا ہوں جب امداد اور تسکین و تسلّی کے لئے کچھ کر سکیں گے۔

کل اصغری[1] نے بہت حسین پھولوں کی دو شاخیں میرے لئے اور ایک نسیم[2] کے لئے بھیجی۔ بعض لوگ کتنے اچھے ہیں۔ نسیم نے بھی اپنے پھول مجھے دے دیئے (وہ کہتی ہیں کہ ان کا گھر ان پھولوں کے قابل نہیں ہے) یہ پھول اس وقت میرے سامنے ہیں۔ کمرے میں ان کی بوجھل شیریں خوشبو پھیل رہی ہے اور ان کی پتّیاں چھیمی کی تصویر کو اس طرح حلقہ کئے ہوئے ہیں جیسے پوجا کے پھول ہوں۔ یہ کیسی خوبصورت تصویر ہے (ننھی ملازم لڑکی کے ساتھ بنّے اسے دانش اور محنت کا اتحاد کہتے ہیں۔) جب میں اپنی میز پر لکھنے بیٹھتا ہوں تو اکثر اسے دیکھتا ہوں اور اس کے چہرے میں اس کے مستقبل کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ مجھے اب تک بہت کچھ نظر آگیا ہے۔ چہرے میں بد دیانتی بد مزاجی یا کینہ پروری کی کوئی لکیر کوئی شکن کوئی نقش نہیں ہے۔ اس کا چہرہ کیا ہے ایک کھلی ہوئی کتاب ہے۔ چنانچہ میں جانتا ہوں کہ وہ بڑی ہو کر ایک صاف دل دوسروں پر بھروسہ کرنے والی خوش مزاج اور رجبتی شخصیت ہو گی لیکن اپنے ابّا کی طرح کچھ احمق بھی۔ دنیا والوں کے بل فریب سے قطعی ناآشنا۔ اس کے معنی ہیں کہ کبھی کبھی وہ اپنا دل بھی دکھائے گی۔ کبھی کبھی لوگ اُسے دھوکا بھی دیں گے لیکن اس کی خوش مزاج مسکراہٹ بجھنے نہیں پائے گی۔ اور اس کی زندگی کبھی ناخوش نہیں ہو گی یہ میں اس لئے کہتا ہوں کہ دکھ اور ناخوشی دو مختلف اور الگ الگ چیزیں ہیں اور بالکل ممکن ہے کہ

---

[1] بیگم منظور قادر۔ [2] بیگم اکبر خاں۔

آدمی دُکھ بھی سہتا رہے اور خوش بھی رہے۔ دُکھ درد خارجی چیزیں ہیں جو بیماری یا حادثے کی طرح باہر سے وارد ہوتے ہیں جیسے ہماری موجودہ جدائی ہے یا جیسے ایک بھائی کی موت ہے لیکن ناخوشی جو اس درد سے پیدا ہوتی ہے اپنے اندر کی چیز ہے، یہ اپنے اندر ہی بڑھتی پنپتی رہتی ہے اور اگر آدمی احتیاط نہ کرے تو پوری شخصیت پر قابو پا لیتی ہے۔ دُکھ درد سے تو کوئی مفر نہیں لیکن ناخوشی پر غلبہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ آدمی کسی ایسی چیز سے لو لگائے جس کی خاطر زندہ رہنا اچھا لگے۔

۵۲

۲ر اکتوبر ۱۹۵۲ء

رؤف کو ایک غزل بھیج چکا ہوں ہمت بالخیر کے طور سے ایک اور نظم[۱] منسلک ہے اس نظم سے میں خاص طور سے خوش ہوں اس لیے کہ مجید[۲] صاحب کے مرغوب الفاظ ہیں۔ Idon't mind Telling you آج کل کوئی اور ایسا نہیں لکھ سکتا نہ بہت عرصے تک لکھ سکے گا۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مجھے اپنی استعداد پر کوئی گھمنڈ ہے۔ اپنی صلاحیتِ ہنر تو بہت محدود ہے اور بہت سے لوگ مجھ سے زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں بات صرف محنت اور عرق ریزی کی ہے۔ خاص طور سے بیانیہ تحریر میں اس نوع کی تحریر میں سہل انگاری کی وجہ سے میلان یہ ہوتا ہے کہ جو بھی گرا پڑا لفظ ہاتھ آجائے یا ذہن میں جو تصویر ہے اُس سے ملتی جلتی جو بھی صورت الفاظ میں ڈھل جائے اسی سے کام چلا لیا جائے۔ اگر اس سہل انگاری سے کام نہ لیا جائے تو پڑھنے والے کو کچھ اندازہ نہیں ہوتا کہ ہر لفظ پر کتنی محنت صرف کی گئی ہے اور کسی لفظ کے آخری انتخاب سے پہلے کتنے بے شمار مترادفات ذہن نے رد کیے ہیں۔ تم شاید ہنس رہی ہوگی کہ ہم اترا رہے ہیں لیکن کبھی کبھی یہ بھی کرنا ہی چاہیے۔

رؤف سے کہہ دینا کہ آخری تین مصرعوں میں شاید ہم کچھ ترمیم کریں۔ لیکن اگر کچھ

---

[۱] زنداں کی شام [۲] کرنل مجید ملک صاحب۔

اور ذہن میں نہیں آیا تو جیسے ہیں ٹھیک ہیں۔ رہی انتساب کی بات تو اگر تم اپنے آپ کو ایلس[1] کہنا چاہتی ہو تو تمہیں اختیار ہے اس لئے کہ کتاب بھی تمہاری ہے میں نے کلثوم اس لئے لکھا تھا کہ اوّل تو یہ مشرقی نام ہے۔ دوسرے یہ کہ لوگ اس کے بارے میں تم سے ضرور سوال کریں گے جو شاید تمہارے لئے تفریحِ طبع کا سامان ہو۔ بہر حال جو تمہارا جی چاہے کرو صرف "میری بیوی کے نام" پر مجھے اعتراض ہوگا یہ انگریزی میں تو ٹھیک ہے لیکن اردو میں کچھ چھچھورا معلوم ہوتا ہے۔

تمہارے گزشتہ خط سے دل بہت خوش ہوا۔ یوں لگا جیسے ہم ابھی تک ساتھ ہیں دراصل اس بار تمہارے جانے کے بعد وہ کیفیت پیدا نہیں ہوئی جو ایسے موقعوں پر پہلے محسوس کرتے رہے جب تو جدا ہونے کے بعد یوں محسوس ہوتا تھا کہ ملے ہوئے برسوں گزر چکے ہیں۔ اور یہاں تمہاری موجودگی کسی دُور دراز دنیا اور کسی بہت پُرانے زمانے کا ایک واقعہ ہے۔ جس پر یکایک فراق کا بھاری پردہ گرا دیا گیا۔ اس بار ابھی تک جدائی کا احساس ہی نہیں ہوا۔ شاید تمہارے خطوط کی وجہ سے یا میری میز پر رکھی ہوئی تصاویر کی وجہ سے یا اس وجہ سے کہ اُمید کی لو پہلے سے زیادہ روشن ہے اور انتظار کے دن تھوڑے رہ گئے ہیں۔

اماں کی وجہ سے ابھی تک پریشانی ضرور ہے اور ان کا دھیان دل سے نہیں جاتا لیکن اس کے علاوہ طبیعت پہلے سے کہیں زیادہ خوش اور بشاش ہے شاید اس وجہ سے بھی کہ میں نے پھر لکھنا شروع کر دیا ہے آج کل یہاں موسم پھر گرم ہو چلا ہے وجہ یہ ہے کہ ان دنوں ہوا بند ہو جاتی ہے اور سندھ کے نحیف جاڑوں کے انتظار میں ہر چیز ساکن اور بے حرکت معلوم ہوتی ہے۔

۵۳

۸ر اکتوبر ۱۹۵۲ء

آج صبح چاند کی تیز روشنی چہرے پر اس طرح پڑی کہ آنکھ کھل گئی۔ جیل کی گھڑیال

---

[1] پہلے ایلس جارج نام تھا۔ شادی کے بعد ایلس فیض کہلائیں۔ فیض کی والدہ نے کلثوم نام رکھا۔

نے ساڑھے چار بجائے۔ میں بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گیا اور ٹھیک اسی لمحے ساتھ کے پلنگ پر ارباب[1] بھی اُٹھ بیٹھا اور مسکرا کر میری طرف دیکھا ارباب تو فوراً ہی دوبارہ سو گیا لیکن میں اُٹھ کر برآمدے میں آبیٹھا اور صبح کی آمد کا نظارہ کرتا رہا۔ پہریدار بدلے تو جیل کے صدر دروازے کے کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ دور کہیں زنجیروں اور چابیوں کی جھنکار سُنائی دی اور مختلف فولادی دروازوں کے جبڑے اس طرح کھلنے اور بند ہونے لگے جیسے وہ آخرِ شب کی تاروں بھری تاریکی کو جلد جلد چبا رہے ہوں۔ پھر ایک خواب آلود حسینہ کی طرح ہلکے سے صبح کی ہوا بیدار ہوئی۔ آسمان دھیرے دھیرے پیلا ہونے لگا اور ستارے موتیوں کے گرداب بن کر تہہ و بالا ہونے لگے۔ میں بیٹھا رہا اور دیکھتا رہا اور کئی طرح کے خیال اور یادیں دل میں آتی رہیں جاتی رہیں۔ شاید ایسی کسی صبح میں اسی چاند نے اسی جگہ سے تھوڑے سے فاصلے پر ایک تنہا مسافر کو پکارا تھا اور اُسے کسی نامعلوم دنیا میں اپنے ساتھ لے گیا تھا اور وہ مسافر میرا بھائی تھا۔ شاید اس وقت یہی چاند ایسے بہت سے چہروں پر چمک رہا ہے۔ جو مر کر درد سے آزاد ہو چکے ہیں۔ کوریا کے کیمپوں میں مقتول قیدیوں کے چہرے اور یہ سب مقتول نوجوان بھی میرے بھائی تھے۔ جب وہ زندہ تھے تو ایسی دور دراز سرزمینوں پر زندہ تھے جو میں نے نہیں دیکھیں لیکن وہ میرے تن میں بھی زندہ تھے اور میرے لہو میں ان کا لہو بھی شامل تھا۔ جن قاتلوں نے انہیں قتل کیا ہے انہوں نے میرے تن کا کوئی حصّہ بھی قتل کیا ہے اور میرا بھی کچھ لہو بہایا ہے۔ بہرحال اب یہ سب مر چکے ہیں۔ جیسے میرا بھائی مر چکا ہے اور مرنے والوں کا پورا ماتم مرنے والے ہی کر سکتے ہیں جینے والوں جینے والوں کی خوشیوں میں شریک رہنا چاہیئے۔

شاید کسی دن میں اس صبح کو شعر[2] میں ڈھال سکوں اور میں نے ارباب کو متنبہ کر دیا ہے کہ اگر ایسا ہوا تو اس کے زندہ جاوید ہو جانے کا خدشہ ہے

---

[1] جیل کے ساتھی ارباب نیاز محمد

[2] زنداں کی صبح۔

وکٹر[1] کا خط دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اُسے جواب لکھ چکا ہوں اور مہربانی سے اسے میری ایران والی نظم بھیج دو اور گزشتہ خط میں زنداں کی شام پر جو نظم ارسال کی تھی وہ بھی۔

تم نے اپنے علاج کے لئے کسی دیسی حکیم کا پوچھا ہے جو مجھے بہت عجیب لگا۔ اگر کسی حکیم سے رجوع کرنا ہی ہے تو حکیم نیرؔ واسطی صاحب سے ملاقات طے کرلو جو منٹو پارک کے قریب رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ مجھے جانتے ہیں اور شاید تمہیں یاد ہو کہ آغا عبدالحمید کے بھائی آغا حبیب ان کے داماد ہیں۔ اگر ان سے ملنے جاؤ تو خدا کے لئے بائیسکل پر مت جانا۔ تانگے پر جاؤ۔

۵۴

۱۴ اکتوبر ۱۹۵۲ء

میں نے یہ خط دو تین دن کے لئے روک لیا تھا تاکہ تمہیں ایک نئی نظم بھیج سکوں۔ لیکن یہ ختم نہیں ہو سکی اس لئے اگلے اتوار تک انتظار کرنا پڑے گا۔ ہفتے کے باقی دنوں میں کوئی کام نہیں ہو سکتا امید ہے کہ اپنے اگلے خط کے ساتھ روانہ کرسکوں گا۔ آخری نظم جو بھیجی تھی۔ شفیع[2] کو پہنچا دو یا پھر یہ نئی نظم بھجوا دینا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ آج کل کسی گردش میں ہیں جو شاید ان کے لئے اچھا ہے۔

سلامت[3] اللہ شاہ کی وفات کا سن کر بہت رنج ہوا۔ بہت اچھے آدمی تھے۔ مجھے علم نہیں کہ تعزیت کا خط کیسے لکھنا چاہئے۔ تم جیسے بھی ہو سکے ان کے گھر والوں کو میری تعزیت پہنچا دو۔ کسی رپورٹر کے ہاتھ پیغام بھجوایا جا سکتا ہے یا مسلم ٹاؤن میں ملکہ پکھراج کو ٹیلی فون کردو۔ اور میرے سلام کے ساتھ یہ پیغام پہنچا دو۔ ملکہ پکھراج کو یہ بھی بتا دینا کہ ہم ریڈیو

---

[1] پروفیسر وکٹر کیرنن جن کی کتاب Poems by Faiz اسی سال یونیسکو کی جانب سے شائع ہوئی ہے۔

[2] جریدہ نگار محمد شفیع جو "م ش" کے نام سے لکھتے اور مشہور ہیں۔

[3] دوست، ایک نیلام گھر کے مالک اور موسیقی کے سرپرست۔

براؤن کے پرانے ریکارڈ اکثر سنا کرتے ہیں۔ اور ہمارے ساتھیوں کا اصرار ہے کہ جب ہم باہر آئیں گے تو انہیں ضرور اپنا گانا ہمیں سنانا ہوگا۔

تو آخر تم نے ایک اچھی فلم دیکھی Street carnamed Desire لیکن اس پر ہمیں کچھ ایسا رشک نہیں آیا اس لئے کہ بہت پہلے ہم نیویارک میں یہ کھیل اسٹیج پر دیکھ چکے ہیں۔ اگرچہ جب کچھ ایسا لطف نہیں آیا تھا اس لئے کہ سب اچھی نشستیں بہت پہلے سے پُر ہو چکی تھیں اور ہمیں بہت دُور اور بہت غیر آرام دہ جگہ ملی تھی۔

۵۵

۲۵ ر اکتوبر ۱۹۵۲ء

آج کل لیلائے سخن غیر حاضر ہے اور شب و روز پر خزاں کی اُداسی چھا رہی ہے اَب میں نے رات کو کام کرنا چھوڑ دیا ہے اس لئے کہ روشنی سے بینائی پر اثر پڑنے لگا ہے۔ اس وجہ سے شامیں طبی اور ویران معلوم ہوتی ہیں۔ اور آج کل میں کچھ لکھ ہی نہیں رہا ہوں۔ یادوں کے ساتھ اکیلے زیادہ وقت گزارنے کو جی نہیں چاہتا اس لئے میں سرِ شام ذہن پر تالا ڈال کر نیند کا انتظار کرنے لگتا ہوں۔ دس بجے تک سو جاتا ہوں اور صبح پانچ بجے جب پہرہ بدلتا ہے تو آنکھ کھُل جاتی ہے۔ اس وقت جیل کی دیواروں سے باہر پہلے مختلف اذانوں کی آواز بلند ہوتی ہے اور پھر پرندے غل مچانے لگتے ہیں۔ صبح کے منظر پر جو نظم شروع کی تھی وہ پہلے بند سے آگے نہیں بڑھ سکی اس لئے میں نے اسے فی الحال سرد خانے میں رکھ دیا ہے۔ اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں یہ فقط الفاظ کی مشق ہے جو صرف اس لئے کی جاتی ہے کہ اوزار سان پر لگے رہیں۔ تمہارا جی چاہے تو یہ شفیع کو دیدو ورنہ نقوش کو بھیجدو۔ وہ لوگ بہت دنوں سے تقاضہ کر رہے ہیں۔

کتاب کی اشاعت کہاں تک پہنچی ہے۔ پریشان افکار کے اس مجموعے کے لئے پریس کانفرنس منعقد کرنا مجھے کچھ مبالغہ سا معلوم ہوتا ہے لیکن شاید اس میں کچھ فائدہ ہو مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں کہ ایسے موقعوں پر کیا کہنا چاہئے۔ شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام ادب خواہ وہ کسی سیاسی نظریئے کسی مکتبِ فکر یا کسی شخص سے متعلق ہو بہر صورت قومی اثاثے کا

جزو ہے اس لئے حالات کچھ بھی ہوں ادب کی تخلیق بہرصورت ایک قومی خدمت کی ادائیگی ہے جس کا کچھ اعتراف اور کچھ قدر ہونی چاہئے۔ شاید یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہر خادمِ قوم کی طرح ہر ادیب کو کم از کم اتنی آزادی ضرور میسّر ہونی چاہئے کہ وہ یہ خدمت انجام دے سکے۔ اس اعتبار سے اگر اُس کی شخصی آزادی کو گزند پہنچایا جائے تو اس اقدام سے صرف اس کی ذات ہی نہیں اور بھی بہت سے لوگ متاثر ہوتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ

یہ سُن کر خوشی ہوئی کہ بخاری[1] دسمبر میں آ رہے ہیں۔ شاید ہم بھی مل سکیں۔ خیر ہم نہ بھی مل سکے تو اور دوست مل لیں گے اور ان کی باتیں اُن دوستوں کی زبانی سُن لیں گے۔

For singing tomorrows[2] بہت حسین ترکیب ہے ہاں سب کچھ آنے والے نغمہ سنج دنوں کے لئے ہے۔ آج کا درد بھی، آنسو بھی، کلفت بھی اور محرومی بھی۔ اور اگر آج کا دن موجود ہے تو کل کا دن بھی برحق ہے۔ اس طرح ہر دُکھ بھرا دن جو گزرتا ہے۔ اپنی تسکین اپنے ساتھ لاتا ہے۔ یہ تسکین ساتھ لاتا ہے کہ جو دن گزر چکا ہمیشہ کے لئے معدوم ہو چکا اور اس کے بعد جو بھی دن آئے گا اُس سے مختلف ہوگا اور بہت ممکن ہے کہ اس سے بہتر ہو، اس لئے لازم یہی ہے کہ آنے والے دنوں پہ نظر جمائے رکھیں گے اور بیتے ہوئے دنوں کو جملہ ساکنانِ عدم کے ساتھ دفن ہو جانے دیں۔

۵۶

۲۷ر اکتوبر ۱۹۵۲ء

تمہارے ابّا کا پڑھ کر بہت پریشانی ہوئی۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ اگر اُن کی حالت میں افاقے کی خبر نہ آئے تو تم جانے کی تیاری کر لو۔ تمہاری امّاں نے جو پیسے بھیجے تھے وہ واپسی کے ٹکٹ کے لئے کافی ہونے چاہئیں اور اگر تم اُن میں کتاب سے جو بچا ہے وہ اور مزید ایک ہزار روپے اپنی بجت سے نکال کر شامل کر لو تو اتنی رقم بن جائے گی کہ

---

[1] پطرس بخاری۔

[2] چلی کے ممتاز شاعر Bablo neruda کی نظم کا عنوان۔

بچے بھی تمہارے ساتھ جا سکیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم انہیں بھی ساتھ لے جاؤ ورنہ تمہیں ان کے بارے میں تشویش رہے گی اور ذہن پر بے جا بوجھ پڑے گا۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے پاس کوئی پیسہ نہیں ہے اور یہ خرچہ بہت بھاری معلوم ہوتا ہے لیکن میں اگر تمہاری جگہ ہوتا تو اس کی مطلق پروا نہ کرتا۔ کھویا ہوا پیسہ تو کسی نہ کسی صورت واپس آجاتا ہے لیکن کھوئے ہوئے انسان واپس نہیں آتے اور اگر کچھ دن فاقہ بھی کرنا پڑے تو وہ عمر بھر کے اس تاسف سے بہتر ہے کہ ہم کسی عزیز کے لئے کچھ کر سکتے تھے جو نہیں کیا اور اب کبھی نہ کر سکیں گے۔

جہاں تک میرا اور یہاں کے معاملات کا تعلق ہے ان کے لئے تمہاری یہاں موجودگی ضروری نہیں۔ اس بارے میں نہ تم کچھ کر سکتی ہو نہ کوئی اور۔ تمہاری مشکل کا مجھے احساس ہے اور میں جانتا ہوں کہ تمہارا بوجھ بٹانے والا بھی کوئی نہیں ہے اتنا بھی نہیں کہ ان مشکلات میں تمہیں کوئی مشورہ ہی دے سکے۔ لیکن مجبوری میں آدمی اس کے سوا کر ہی کیا سکتا ہے کہ جی کڑا کر کے سب کچھ برداشت کئے جائے۔ حتیٰ کہ امتحان ٹل جائے۔ بہرصورت جو بھی تم فیصلہ کرو میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اپنا سر اونچا رکھو اس لئے کہ بہت کچھ اسی پر منحصر ہے اور ان کمینہ فطرتوں کو نظرانداز کر دو جو اس صورت حال کے ذمہ دار ہیں۔ وہ ہماری حقارت کے قابل بھی نہیں۔

۵۷

۶ نومبر ۱۹۵۲ء

کاش مجھے پہلے معلوم ہوتا کہ تم سیالکوٹ جا رہی ہو تو فرمائش کرتا کہ ہمارے بچپن کے ٹھکانوں کی زیارت بھی کر آؤ۔ میرے بچپن کے دوست اور اُن کے گھر والے تم سے مل کر یقیناً باغ باغ ہوتے۔ خیر۔ پھر کبھی ساتھ وہاں چلیں گے۔ فی الحال تم مجھے بتا دینا کہ وہاں کیسے گزری۔

غالباً تمہیں اطلاع ہو گئی کہ یہاں کے طول طویل ڈرامے کا ڈراپ سین ہو چکا ہے اور باقی اب جو تقدیر دکھائے ——— سنسر نے کاٹ دیا ——— صرف چند ہفتے باقی ہیں اور اگرچہ مجھے اپنے دل میں یقین ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔ لیکن اگر ہمیں کلفت اور انتظار کے کچھ

اور دن بھی بسر کرنے پڑے تو مجھے اس سے بھی قوی یقین ہے اور امید اور تحمّل کے سہارے ہم انہیں بھی گزار دیں گے جب تک زندگی باقی ہے کسی مصیبت کے سامنے سرنگوں نہیں ہونا چاہیئے اس لئے کہ کسی نہ کسی طرح سب نقصانات پورے ہو جاتے ہیں اور سب دکھ درد کی تلافی ہو جاتی ہے، اہم چیز صرف اپنی زندگی اور اپنی جان ہے جو خیر تمام بھی ہے۔ اور امید پر حق بھی اور مجھے معلوم ہے کہ زندگی باقی ہے۔

کتاب کے سرورق کا ابھی سے طے کر لیں تو اچھا ہو۔ حیدر[1] اس بارے میں مشورہ دے سکیں گے۔ جہاں تک لوگوں کو تحفتاً بھیجنے کا تعلق ہے جب کتاب تیار ہو جائے گی تو یہ بھی طے کر لیں گے جیسے تم نے لکھا ہے میری ایسی سہیلیوں کی تعداد جنہیں خوش کرنا مقصود ہو کچھ ایسی زیادہ نہیں جو بہت افسوس کی بات ہے۔ آمنہ[2] تو ہیں ہی اور پھر میری نئی دوست شوکت[3] ہارون ہیں۔ ہندوستان میں چھبا[4] اور بس۔ میرے خیال میں ہمارے مرد دوستوں کی تعداد بھی اتنی ہی ہو گی۔

تو آخر ...... [5] تم سے ملنے آ ہی گئیں۔ یہ سن کر خوشی ہوئی۔ اور زیادہ خوشی اس بات سے ہوئی کہ تم اُن سے ہمیشہ کی طرح ملیں۔ اگر اپنا دل بڑا ہو تو اُسے اس وجہ سے چھوٹا نہیں کرنا چاہیئے کہ کسی دوسرے کا دِل چھوٹا ہے۔ دوستوں کے بارے میں اپنے مغالطے یا خوش فہمی دور کر لینا اچھی بات ہے لیکن ان کے چھوٹ جانے پر اپنا دل جلانا یا ان پر یہ الزام دھرنا کہ وہ تمہاری خوش فہمیوں کے مطابق ثابت نہیں ہوئے صحیح بات نہیں ہے۔ کسی کے بارے میں خوش فہمی یا مغالطہ تو اپنی ہی خطا ہوتی ہے نہ کہ دوسرے کی جو کوئی جیسا بھی ہے اُسے ایسا ہی قبول کر لینا چاہیئے۔ اس سے قطع نظر کہ تمہارے

---

[1] کمال حیدر نیوز ایڈیٹر پاکستان ٹائمز۔ [2] بیگم آمنہ مجید ملک

[3] حاجی سر عبداللہ ہارون مرحوم کی صاحبزادی ڈاکٹر شوکت ہارون جن کا انتقال ہو گیا ہے۔

[4] مسز چھبا منگت رائے۔ لاہور کے ایک ممتاز عیسائی خاندان سے ہیں۔

[5] نام ظاہر کرنا مناسب نہیں ہے۔

خیال میں اسے کیسا ہونا چاہئے تھا۔ اور کسی سے بھی زیادہ توقع وابستہ نہیں کرنی چاہئے ایک نامکمل نظم[۱] بھیج رہا ہوں۔ رؤف سے کہو اسے کتاب میں شامل کریں اور کسی کو چھپنے کے لئے نہ دیں۔ عدالت کے بارے میں تمہارے سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر تم چاہو تو شکریہ کا خط لکھ دو۔ مگر کتاب کی اشاعت کی اجازت کے لئے شکریہ کی ضرورت نہیں۔ اس سے تو عدالت کا کوئی علاقہ نہیں۔ البتہ اس بات کا شکریہ ادا کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے یہ نظمیں باہر بھجوانے کی اجازت دیدی۔

۵۸

۷ / نومبر ۱۹۵۲ء

تمہارے لندن جانے میں رکاوٹ کا افسوس ہے لیکن ممکن ہے کہ بعد میں سب ٹھیک ہو جائے، کچھ کہہ نہیں سکتے۔ سرکاری کاروبار یوں چلتا ہے کہ بعض اوقات دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ کی خبر نہیں ہوتی اس لئے فیصلے، فیصلوں کے مخالف فیصلے اور مخالف فیصلوں کے مخالف فیصلے سرکاری دفتروں کا عام معمول ہیں لیکن وقت اتنا تنگ ہے کہ معاملہ صاف ہونے تک شاید ہاں یا نہ سے کچھ فرق ہی نہ پڑے۔ تمہارا خیال بالکل غلط ہے کہ میرے باہر آنے سے پہلے تم (اپنے) ابا کو دیکھنے نہیں جا سکتیں۔ انگلستان جانے کیلئے نہ ویزا درکار ہے اور نہ کوئی تصدیق۔ ہم ابھی تک دولتِ برطانیہ کی رعایا ہیں اور ملکہ EEss ہمیں اپنی سلطنت کے کسی بھی علاقے میں کیسے روک سکتی ہیں۔

میں نے گزشتہ خط میں تمہیں جلد آنے کے لئے لکھا تھا تاکہ چند ذاتی معاملات کے بارے میں کچھ طے کریں۔ اس خیال سے کہ شاید ہم کرسمس تک گھر نہ پہنچ سکیں اور گھر آنے کی دعوت پھر ملتوی کرنی پڑے۔ بہتری کی امید تو ہمیشہ رکھنی چاہئے۔ دانشمندی اسی میں ہے کہ ناگوار صورتِ حالات کا امکان بھی پیشِ نظر رہے۔ آئندہ کے بارے میں انسانی علم بہت محدود ہوتا ہے اور تکلیف دہ حادثات کے امکانات ہمیشہ موجود، اس لئے

---

[۱] زنداں کی ایک صبح۔

ہر کسی کو اس حد تک فلسفی ضرور ہونا چاہیے کہ جو بھی صورت پیش آئے اُسے زیادہ ششدر یا سراسیمہ ہوئے بغیر قبول کرے ہم تو اس بارے میں بہت زیادہ فلسفی ہیں۔ اوّل یہ جانتے ہوئے کہ خیر کی ہار کبھی نہیں ہوتی اور دوم یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم میں اتنی ہمت اور سمجھ بوجھ موجود ہے کہ کل جو بھی سامنے آئے گا تم اسے دلجمعی اور حوصلے سے برداشت کر لو گی۔ اصل میں تمہیں یہی کچھ کہنے کے لئے بلایا تھا۔ اگرچہ یہ سب کچھ کہنے کی ایسی کچھ ضرورت بھی نہیں۔ اس کے علاوہ کوئی خاص معاملہ نہیں جسے فوری طور پر حل کرنا ضروری ہو۔ کبھی فراغت سے سب باتیں طے کریں گے گھر بیٹھ کر یا جہاں بھی مقدّر ہمیں ملنے کی اجازت دے۔ میرا ہرگز یہ منشا نہیں کہ اِدھر جو کچھ میں نے لکھا ہے اُس سے تم کوئی اور نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کرو یا کوئی نئے وسوسے اپنے دل میں لاؤ۔ یہاں کی صورتِ حال میں کسی نئی بات کا اضافہ نہیں ہوا ہے وہی صورت ہے جو ہمیشہ سے تھی یعنی اُمید کا ایک دودھیا بادل ہے اور اس کے ساتھ بے یقینی کی ایک سیاہ دھاری۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کے معنی صرف اس قدر ہیں کہ اس سیاہ دھاری کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے اور اپنے ذہن کے دفاعی انتظامات ٹھیک رکھنے چاہئیں چونکہ تھوڑے دن باقی ہیں اس لئے یہ سب کچھ ذہن میں رکھ کر اپنے سفر کے بارے میں جلد فیصلہ کرو۔ اور اگر تمہارا چھٹی لینے کا ارادہ ہے تو بہتر ہوگا کہ دو تین دن یہاں گزار کے تبدیلیٔ آب و ہوا کی خاطر کچھ دنوں کے لئے کراچی چلی جاؤ۔ میں اس سے زیادہ کوئی قطعی مشورہ نہیں دے سکتا ویسے میرا اپنا اُصول تو یہی ہے کہ جب کسی بات میں شک ہو تو اپنے دل کی بات مانو۔ تمہارے لئے جیسے بھی آسانی ہو ویسے کرو۔ مجھے اتفاق ہوگا۔

۵۹

۱۰ر نومبر ۱۹۵۲ء

مجھے افسوس ہے کہ تمہارے ابّا[۱] کے بارے میں نئی اطلاع تشفی بخش نہیں۔ بہرحال

---

[۱] فیض کے جیل جانے سے چند ماہ بیشتر ڈاکٹر تاثیر کا اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر تاثیر اور فیض ہم زلف تھے۔ انتقال اور اسیری کی ناگہانی مصیبتوں نے مسٹر جارج کی علالت میں اضافہ کر دیا۔

بہتری کی اُمید رکھنی چاہئے دنیا میں دُکھ اتنا زیادہ ہے اور اپنا اختیار اتنا کم کہ اس دُکھ سے نپٹنے کے لئے اپنی پوری ہمت درکار ہے، اسی سبب سے اُمید کی شمع جلائے رکھنا اور بھی زیادہ ضروری ہے۔

اب سے پہلے مجھے اس بات پر بڑا مان تھا کہ اپنے میں اور جو بھی عیب ہو ہم نے جان بوجھ کر کسی کے دکھ میں اضافہ نہیں کیا۔ اب یہ مان بُری طرح ٹوٹ چکا ہے اگرچہ اس میں بھی خطا میری نہیں۔ جیسے تم نے لکھا ہے تمہارے ابّا کی علالت میں بھی زیادہ دخل اپنی بچیوں کی ناگہانی مصیبتوں پر ان کے دلی رنج و غم کو ہوگا۔ ان کے نحیف و نزار دل کو کتنا ملال ہوگا کہ ان کی دونوں بچیاں جو کہیں کالے کوسوں دور نکل گئی ہیں اپنی مصیبت میں انہیں پکار رہی ہیں۔ لیکن وہ ان تک پہنچ نہیں سکتے۔ میں ان کا درد اپنے دل میں محسوس کر سکتا ہوں اس لئے کہ ہم بھی ایسی ہی افتاد سے دوچار ہیں۔ لیکن اوّل تو ان کے پاس وہ ذہنی سہارے موجود نہیں جو مجھے میسّر ہیں۔ پھر ہم ایک دوسرے سے اتنے دور بھی نہیں اور اس کے علاوہ آج کل کے اندھیرے سایوں سے پرے بقیہ زندگی کا روشن راستہ بھی ہماری نظر میں ہے۔ لیکن خدا نہ کرے کہ مجھے بڑھاپے اور ضعیفی کے عالم میں کسی ایسے دُکھ کا سامنا کرنا پڑے جب آدمی صرف ماضی ہی پر نگاہ دوڑا سکتا ہے اور مستقبل کا سہارا باقی نہیں رہتا۔ بہر حال جن حالات کا مداوا اپنے بس میں نہ ہو ان کی خاطر دل جلانا بے کار ہے، ہم اپنے بیچارے غمزدہ والدین کے لئے یہی کر سکتے کہ جس قدر محبت اور دلجوئی ممکن ہو سکے انہیں بہم پہنچائیں اور ان پر یہی ظاہر کریں کہ ہم زندگی سے اتنے زخم خوردہ نہیں ہیں جیسا کہ معلوم ہوتا ہے اور کسی نہ کسی دن ستارے موافق ہو ہی جائیں گے تو بات وہیں پہنچتی ہے جہاں سے چلی تھی یعنی یہ کہ ہم دوسروں کو رنج و خوشی برداشت کرنے میں جبھی امداد دے سکتے ہیں جب ہم اپنی ناخوشی کو قابو میں رکھیں کسی دوسرے کو خوش کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ آدمی خود خوش نظر آئے یہ بعض اوقات مشکل تو ہوتا ہے لیکن کرنا ہی چاہیئے۔

یہ سُن کر خوشی ہوئی کہ تم نے باغبانی شروع کر دی ہے۔ آج کل ہم بھی کر رہے ہیں اور ہم نے بہت سے پھول بوئے ہیں۔ ان کے اُگنے میں تو کافی دن لگیں گے لیکن غالباً کچھ پھول تو

دکھائی دے ہی جائیں گے۔ جو ہم نہیں دیکھیں گے ان سے بعد میں آنے والوں کا دل خوش ہوگا۔ آج کل میں ایک بہت عمدہ کتاب پڑھ رہا ہوں یہ Sit well بھائی بہن کے والد Sir george sitwell کی تصنیف The making of Italian gardens ہے۔ اس میں کچھ باغبانی کے فنّی نکات ہیں اور کچھ ان کے تاثرات۔ کتاب کا بہت حصّہ تو میری سمجھ سے بالا ہے اس لئے کہ مجھے پھلوں اور اشجار کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم (ہم تو صرف انہیں دیکھ کر خوش ہو لیتے ہیں) لیکن جس چٹخارے سے بڑے میاں لان، اور ریاض باغ اور فوّاروں اور بارہ دریوں کا ذکر کرتے ہیں اس لطف میں میں بھی شریک ہو لیتا ہوں۔

نئے موسم کے خیر مقدم کے لئے کچھ تک بندی[1] کی ہے جو بھیج رہا ہوں اس کی خوشی ہے کہ اب عام فہم زبان پر کچھ عبور حاصل ہو چلا ہے لیکن جو کچھ میں لکھ رہا ہوں یہ تو محض اسلوب واظہار کے بھٹکل تجربے ہیں اور اس اُمید سے کہ شاید بعد میں زیادہ وزنی موضوعات پر کچھ لکھا جاسکے۔

۶۰

۲۰ نومبر ۱۹۵۲ء

تمہارا گزشتہ خط اتنا اُداس[2] تھا کہ دل کچھ سہم سا گیا اور میں نے جواب اس خیال سے روک لیا کہ کہیں میں بھی ایسی ہی افسردہ باتیں نہ لکھ دوں۔

اَب تمہارا دوسرا خط آیا تو بات سمجھ میں آگئی۔ اگر دلی جذبات کے بارے میں میری باتیں کچھ سنگ دلانہ معلوم ہوتی ہیں تو مجھے افسوس ہے، اصل میں میری مراد یہ نہ تھی، خود میرا دل بھی ایسا سخت نہیں جیسا میں ظاہر کرتا ہوں۔ ذراسی بے احتیاطی کرد تو بُری طرح دُکھنے لگتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آنسو اور دردِ دل کوئی عیاشی یا خطاکاری

---

[1] فیضؔ اوجِ خیال سے ہم نے ___ آسمان سندھ کی زمین کی ہے۔

[2] ایلس کے والد فوت ہو گئے۔

نہیں جس پر نکتہ چینی یا حرف گیری کی جائے۔ ہمارے ایسے حالات میں تو یہ زندگی کا تقاضا ہیں اور انہیں بالکل دبانے کی کوشش نہ صرف اپنے پر بے وجہ اور ناقابلِ برداشت بوجھ ڈالنا ہے بلکہ ایک طرح سے جھوٹ اور ریاکاری بھی ہے جو غیر اخلاقی باتیں ہیں۔ اگر تم سمجھتی ہو کہ میں نے تم سے اس نوع کے جان لیوا بیراگ کا مطالبہ کیا ہے تو غلط ہے۔ یہ مطالبہ تو میں اپنے آپ سے بھی نہیں کرتا۔ مجھے مشکل اوقات میں جس چیز سے تشویش یا ڈر محسوس ہوتا ہے وہ یہ چیز نہیں ہے۔ میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ جب دل میں درد و کرب کا طوفان بپا ہے تو سر اتنا بلند ضرور رہنا چاہیے کہ مستقبل میں اُمید کی کرن نظر آسکے، زندگی پر اپنا ایمان قائم رہ سکے اور حُسن و خوبی سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت ضائع نہ ہونے پائے، اگر ان پانیوں کو سر سے گزر جانے دیں تو آدمی کھو جاتا ہے۔ اپنا توازن ایک دفعہ ہاتھ سے نکل جائے تو پھر مشکل سے گرفت میں آتا ہے۔ خوف و خطر کا مرحلہ یہی ہوتا ہے۔ جب موجیں دھاڑتی ہوئی ٹھاٹھیں مارتی آتی ہیں اور تیرہ و تار سیلاب کا خاتمہ کہیں دکھائی نہیں دیتا جب ہاتھ پاؤں سرد اور شل ہو جاتے ہیں اور مزید جدوجہد انتہائی اذیت ناک معلوم ہوتی ہے لیکن یہ جدوجہد تو جاری رکھنی ہی پڑتی ہے صرف اپنی جان کے بچاؤ کی خاطر نہیں بلکہ ان سب چیزوں کی خاطر بھی جنہیں آدمی عزیز اور مقدس اور بیش قیمت جانتا ہے۔ اس لئے تم اپنے آنسو بچا کر نہ رکھو صرف اپنا سر نیچا نہ ہونے دو۔ اس لئے کہ طوفان گزر جائے گا، بادل کھل جائیں گے اور سورج کی روشنی پھر ہر سو پھیلے گی۔ کل نہیں تو پرسوں یا شاید بہت دن کے بعد جب بھی ہو یہ ہونا یقینی ہے۔

اگر تم نے میری گزشتہ نظم امروز کو بھیج دی ہے تو مضائقہ نہیں، سبھی پڑھنے والوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔ ادیب کسی ایک کا ہو کر نہیں رہ سکتا۔ اور ظاہر ہے کہ سب چاہنے والوں کی گرہ میں ایک جیسے دام نہیں ہوتے۔

۶۱

۲۲ر نومبر ۱۹۵۲ء

گزشتہ پیر تمہارے تین خط ایک ساتھ ملے تھے۔ اس کے بعد کوئی خبر نہیں آئی۔

کچھ دنوں تک خط نہ آئے تو یہاں کی تنہائی میں اضافہ ہو جاتا ہے اور چونکہ تم اپنے نالائق میاں کی طرح کاہل اور کام چور نہیں ہو اس لئے تشویش ہونے لگتی ہے۔

یہ لکھا ہی تھا کہ تمہارا خط آ گیا۔ یہ سال ختم ہونے کو ہے اور شاید ہماری آزمائش بھی۔ اس لئے دل خوش رکھو اور براؤننگ کی نظم ربی بن عذرا یاد کرو

میرے ساتھ ساتھ بڑھاپے کی منزل تک چلو
بہترین دن تو ابھی آگے آئیں گے

یہ سوال نہیں ہے کہ کونسی چیز کس چیز کے قابل ہے، کیا شہرت اس قابل ہے کہ اس کے لئے دل لہو کیا جائے یا وصال اس قابل ہے کہ اس کے لئے فراق جھیلا جائے۔ بات یہ ہے کہ اگر تن میں جان ہے اور آدمی اپنی دیانت اور خلوص باطن کے بھروسے پر سر اٹھا کر چل سکتا ہے تو زندگی میں جو بھی پیش آئے۔ رنج ہو یا راحت، ہر چیز اپنی اپنی جگہ اچھی ہے اور اس کا کسی اور چیز کا بدل ہونا ضروری نہیں یہ خط اس خیال سے لمبا نہیں کرنا چاہتا کہ اگر اس ہفتے کے آخر میں تمہارا آنے کا ارادہ ہے تو چلنے سے پہلے تمہیں مل جائے۔

۶۲

۲۶ نومبر ۱۹۵۲ء

یہ خط میں نے اس امید میں روک لیا تھا کہ تمہیں دو نظمیں ایک ساتھ بھیج سکوں گا تاکہ حساب برابر ہو جائے لیکن عروس سخن بالکل اور بے وجہ غیر حاضر ہے۔ یہ جو چند سطور اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں صرف ہاتھ کی صفائی ہے اور اس میں آمد کا خاص دخل نہیں میرا خیال ہے کہ جیل کے تجربے کا میں نے آخری قطرہ تک نچوڑ لیا ہے۔ اور اس بارے میں اب کچھ کہنے کو نہیں رہا۔ ذہن کو غذا بہم پہنچانے کیلئے زندگی اور تجربات اور دوسرے انسانوں سے میل ملاپ ضروری ہے لیکن ہم جس علیحدگی میں رہتے ہیں اس میں آدمی پہلے سے جمع شدہ تجربات کا مصالحہ اپنے اندر سے نکالتا رہتا ہے اور باہر سے کچھ وصول نہیں ہوتا۔ آخر کار یہ ذخیرہ ختم ہونے لگتا ہے اور ذہن سوکھ جاتا ہے، لیکن امید اور تخیل کی مہربانی سے کچھ نہ کچھ پھر بھی بچ رہتا ہے۔

خیر اَب میں اور نہ بھی لکھوں جب بھی باہر جو کچھ لکھا جا رہا ہے پڑھتا ہوں تو دل اپنے آپ سے خوش بھی ہوتا ہے۔ نازاں بھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب لوگوں کی زبانیں پھر سے کھل گئی ہیں اب ان کی تحریروں میں رنگ اور جذبہ پہلے سے کہیں فراواں ہیں اور ہم اپنے سے خوش یوں ہوتے ہیں کہ دو سال پہلے جو جمود طاری تھا اُسے توڑنے میں شاید کچھ تھوڑا سا بالواسطہ ہی سہی ہماری اسیری کا اور جو کچھ میں نے لکھا ہے اس کا بھی حصّہ ہو بہت شدّت سے جی چاہتا ہے کہ ہمیں قدرت سے ذرا زیادہ جوہر ملا ہوتا اس لئے کہ جہاں تک میں چلتا ہوں وہیں تک اور لوگ چلتے ہیں۔ جہاں میں رُک جاتا ہوں وہ بھی رُک جاتے ہیں۔ ان کے پاؤں ہم سے کچھ آگے بڑھتے تو ہم بھی کسی کی پیروی کر سکتے۔ تم کہو گی ہم پھر اتھلا رہے ہیں لیکن بیوی کے سامنے تو آدمی یہ کہہ ہی سکتا ہے خوب جانتے ہوئے کہ اس پر خاک رعب نہیں پڑے گا۔

سردی شروع ہو چکی ہے اور میں نے اپنی شبینہ بیٹھک پھر کھول دی ہے۔ جہاں لوگ کھانے کے بعد کافی کے لئے جمع ہوتے ہیں تم کبھی آ کر دیکھو کہ ہم اپنا کمرہ کتنا صاف ستھرا رکھتے ہیں تو بالکل ہکّا بکّا رہ جاؤ۔ پلنگ سے لگی ہوئی میز پر کچھ گلاب کے پھول ہیں جو ارباب کا تحفہ ہیں۔ کتابوں کے شیلف پر جنگلی پھول پتوں کا گلدستہ ہے جو نسیم کا تحفہ ہے۔ ایک جانب سے شنیل نمبر ۲۲ کی بھینی بھینی خوشبو اُٹھ رہی ہے جو بیگم ارباب میرے لئے چھوڑ گئی تھیں اور دوسرے کونے سے اس عطر کی تیز لپٹیں آ رہی ہیں جو آمنہ نے بھجوایا تھا۔ رات ڈھلے جب چاند نکلتا ہے تو یہ کسی نواب کا خلوت کدہ معلوم ہوتا ہے صرف اپنا دل اُجاڑ ہے کہ اس فضا کو پُر کرنے کے لئے اپنی چھوٹی بڑی محبوباؤں[1] کی ہنسی اور محبّت یہاں موجود نہیں لیکن وہ دن بھی آ جائے گا اگلے ہفتے، اگلے مہینے، اگلے سال کبھی تو آئے گا۔ تو بس اسی دن کا سوچو اور یہ تصور کرو کہ جب وہ آئے گا تو کتنا اچھا دن ہوگا۔

---

[1] ایلس، چھیمی، میزی

٦٣

٢ دسمبر ١٩٥٢ء

کتاب کا نیا گرد پوش ٹھیک ہے لیکن اس پر میرا پورا نام لکھنا چاہیئے۔ میرے علاوہ کچھ اور لوگ بھی فیضؔ تخلص کرنے لگے ہیں۔

میں نے سُنا ہے کہ میاں صاحب[1] یہاں آئے تھے لیکن مل نہیں سکے مجھے کچھ علم نہیں کہ انہیں ملاقات کی اجازت کیوں نہیں ملی اور میں اس بارے میں کچھ کر بھی نہیں سکتا۔ اگر ان کا دوبارہ اِدھر آنے کا ارادہ ہو تو انہیں چاہیئے کہ اس بارے میں پہلے سے کچھ بندوبست کروالیں تاکہ اگر کوئی مغالطہ ہوا ہے تو صاف ہو جائے۔ کتاب کا اقرار نامہ لوٹا رہا ہوں ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے۔

تم نے بالی کے لئے کسی پیغام کا ذکر کیا تھا جو میں سمجھا نہیں۔ ظاہر ہے ہم ایک ہزار روپیہ تو جمع کر ہی سکتے ہیں اور اس کے علاوہ کچھ اور بھی دے سکتے ہیں یہ کچھ رنج دہ سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن آخر میں نے بھی تو اپنی شادی کے وقت کرائے کے لئے پیسے کسی[2] سے اُدھار لئے تھے۔ دن بدلتے رہتے ہیں یہ تنگ دستی کے دن بھی بدل جائیں گے تو ملول اور رنجیدہ ہونے سے مطلب؟

٦٤

٧ دسمبر ١٩٥٢ء

آج کوئٹہ سے رفیق[3] ملنے آئے تھے۔ میرے لئے کچھ پھل اور دوسری چیزیں لائے تھے۔ اور ایک سو روپیہ بھی چھوڑ گئے ہیں۔ بہت اچھا لڑکا ہے۔ چنانچہ اب مجھے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔

---

[1] میاں افتخار الدین مرحوم۔

[2] میاں افتخار الدین مرحوم سے تین سو روپے قرض لئے تھے۔

[3] رفیق احمد لیبر کمشنر حکومتِ پنجاب۔ فیضؔ کے بھانجے۔

آٹوگراف جو تم نے مانگے تھے منسلک ہیں۔ دوستوں کا انتخاب تم خود کر لو۔ نظامی[1] نے لکھا ہے کہ جتنے اشتہار تم چاہو وہ مفت چھاپ دیں گے۔ رؤف[2] سے کہنا کہ کتاب کا ایک نسخہ ڈاکٹر ذاکر حسین کو علی گڑھ بھجوا دیں اور ڈاکٹر سلیم الزماں کو کراچی میں۔ نقش فریادی کے بارے میں کارواں[3] کا کوئی جواب نہیں آیا۔ تم آ ؤ گی تو طے کریں گے۔ یہ سُن کر خوشی ہوئی کہ چغتائی صاحب[4] نے سرورق بنا دیا ہے۔ اُمید ہے کہ اچھا ہو گا ان کا ایک محبّت بھرا خط بھی آیا تھا۔

ہمارے چھوٹے سے باغیچے میں اب پھول کھلنے لگے ہیں جو لُطف و انبساط کا مستقل سامان ہیں۔ ہر صبح آنکھ کھلتے ہی میں تصور کرتا ہوں کہ آج سبزہ زار پر کون سے نئے رنگ ہمارا خیر مقدم کریں گے۔ اور بستر سے اُٹھتے ہی یہ دیکھنے جاتا ہوں کہ آج کونسی نئی ولادت ہوئی ہے عام طور سے مایوسی نہیں ہوتی اور کوئی نہ کوئی نیا پھول دیکھنے میں آتا ہے جس دن پہلا کھِلا تھا ـــ نام تو نہیں جانتا ـــ شوخ قرمزی رنگ کا چھ پتیوں والا پھول تھا اس دن مجھ جیسے پتھر دل پر بھی عجیب کیفیت طاری ہوئی تھی۔ اب ہم نے انڈوں سے کچھ چوزے بھی پیدا کر لئے ہیں۔ ان چوزوں کی اور ہماری بہت یار آور بلّی کی کوششوں کی وجہ سے یہاں سب لوگوں کے مادرانہ اور پدرانہ جذبات کی تسکین ہوتی رہتی ہے۔ تمہارے لئے ایک چھوٹا سا تحفہ ملفوف ہے۔ غالباً یہ اس جگہ پر آخری نظم[5] ہو گی اور اس سے تمہاری قمیص کا حساب پورا ہو جائے گا۔ آج کل بہت سے سالنامے نکل رہے ہیں اور مجھ پر فرمائشوں کی بھرمار ہے۔ اس لئے جسے جی چاہے بھیج دو۔ آج ایک اچھی ہسپانوی کہاوت سنی۔

How niceitis to do nothing and rest after wards.

کیسا بھلا لگتا ہے کہ آدمی کچھ نہ کرے اور اس کے بعد سستانے بیٹھ جائے۔

---

[1] حمید نظامی مرحوم مدیر نوائے وقت، لاہور [2] رؤف ملک

[3] مکتبہ کارواں، لاہور۔ [4] عبدالرحمٰن چغتائی

[5] یاد (دشتِ تنہائی میں اے جانِ جہاں لرزاں ہیں)

۶۵

۱۹/ دسمبر ۱۹۵۲ء

یہ مختصر خط تمہارے حوصلہ افزا خط کے شکریے کے طور پر لکھ رہا ہوں۔

یہاں ابھی تک کوئی خبر نہیں ہے اور غالباً ابھی کچھ دنوں تک مقدمے کے متعلق کوئی خبر ہوگی بھی نہیں۔ آج میں نے اپنی کتابیں دوبارہ کھولی ہیں اور پھر پڑھنا شروع کر دیا ہے اگر دل نے ساتھ دیا تو شاید ایک دو دن میں کچھ لکھ بھی سکوں۔ اخباروں میں ہمارے شاہکار کا کوئی ذکر دیکھنے کا انتظار رہا لیکن ابھی تک کچھ نظر نہیں آیا۔ امید ہے کہ اگلے خط میں تم کچھ بتا سکو گی اور اگر کتاب تیار ہے تو کچھ نسخے بھی بھجوا دو گی۔ کارواں والوں سے بات ہوئی کہ نہیں۔ بہرصورت میں ایک اقرار نامہ بھیج رہا ہوں جس سے تمہارا جی چاہے بات چیت کر لینا۔ شرط صرف اتنی ہے کہ رائلٹی پیشگی ادا کی جائے۔ میں اگلے تین چار دن میں اپنے مضامین بھی بھجوا دوں گا۔ اور رؤف سے کہنا کہ باقی جو کچھ کرنا ہے وہ خود کریں یہ کوئی ایسی خاص کتاب[1] تو نہیں ہوگی لیکن تاریخی نقطۂ نگاہ سے یہ پرزے محفوظ ہو جائیں تو اچھا ہے۔

۶۶

۲۲/ دسمبر ۱۹۵۲ء

کل خط لکھنے کا وعدہ پورا نہیں کر سکا جس کا افسوس ہے لیکن دل اتنا خوش تھا کہ کچھ کرنے کو جی ہی نہ چاہا اور میں نے تمام دن بستر میں گزارا۔ آج بھی کھیل کے وقت سے پہلے اٹھنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے اور یہ خط بستر ہی سے لکھ رہا ہوں۔ آخر ایسی چھٹیاں روز روز کب آتی ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان میں مکمل عیاشی نہ کریں۔ عیاشی کی انتہا یہ ہے کہ میں نے دو دن سے اخبار نہیں پڑھا لیکن بدقسمتی سے آج کے بعد شاید یہ کیفیت قائم نہ رہ سکے گی۔ ابھی سے کچھ کچھ بوریت ہونے لگی ہے۔ مستقل کاہلی شاید صرف ہسپانویوں یا چینیوں ہی کو راس آسکتی ہے۔ (ماؤ اور اس کے ساتھیوں

---

[1] میزان۔ فیض کے مضامین کا مجموعہ۔

کے رنگ میں بھنگ ڈالنے سے پہلے کے چینیوں کا ذکر ہے۔)

تم جیسی جفاکش اور محنتی شخص کو یہ انتہائی خود غرضی معلوم ہوتی ہوگی لیکن وعدہ ہے کہ گھر آئیں گے تو ایسے ہی آرام کا لطف تمہیں بہم پہنچائیں گے۔ کچھ دن صبح کی چائے میں بناؤں گا۔ بچّوں کو اسکول کے لئے تیار کروں گا اور باورچی خانے کا سامان خود نکالوں گا تم سمجھتی ہوگی کہ یہ بالکل ناممکن ہے اور یہ وعدہ ایسا ہی ہے جیسے سگریٹ چھوڑنے کا وعدہ خیر تم دیکھ لینا۔

یہ بکواس میں اس لئے کر رہا ہوں کہ تم سے ملنے کے بعد دل بہت ہلکا اور بے فکر محسوس ہوتا ہے۔ اگرچہ اسی دل میں کہیں اُس غم کا بوجھ بھی ہے جو تم اپنے ساتھ لائی تھیں اور اُن غموں کا بھی جو پہلے سے میرے ساتھ تھے۔ لیکن میں نے فی الحال کچھ عرصے کے لئے ان غموں کو الگ رکھ دیا ہے جب تک کوئی تازہ زخم بھر نہ جائے اور دل کسی غم کو مستقل مہمان کے طور سے قبول نہ کرے اس وقت تک بہتر یہی ہے کہ اس غم سے کنارہ کشی کر لی جائے اگرچہ پھر بھی کبھی کبھی اس سے اچانک مڈبھیڑ ہو ہی جاتی ہے جیسے دہکتے ہوئے کوئلے یا کانچ کے ٹکڑے پر پاؤں پڑ جائے تو ایک لمحے کے لئے دل بلبلا اُٹھتا ہے لیکن یہ لمحہ بہت جلد پیچھے رہ جاتا ہے اسی لئے میں تمہارے تازہ صدمے کا ذکر نہیں کروں گا نہ تمہیں دلاسہ دینے کی کوشش کروں گا۔ موت کی خوفناک ابدیت کے لئے کوئی بھی موزوں الفاظ نہیں صرف محبّت اور شدّتِ غم کچھ تلافی کر سکتے ہیں۔ اور ان دونوں کے لئے الفاظ درکار نہیں ہوتے۔

٦٧

٢٩ر دسمبر ١٩٥٢ء

کتابیں ابھی تک نہیں پہنچیں۔ غالباً کہیں راستے میں ہوں گی۔ کارواں والوں نے جو اقرار نامہ بھیجا ہے اس خط کے ساتھ منسلک ہے۔ وہ لوگ نقشِ فریادی رائلٹی کی شرائط پر چھاپنے کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ بعد کی اشاعتوں کے حقوق انہیں منتقل کر دیئے جائیں۔ میں نے انہیں لکھا ہے کہ تم سے براہ راست تفصیلات طے کریں۔ رؤف نے باقی مضامین بھیج دیئے ہیں لیکن بہتر ہے کہ اب وہ یہاں کچھ فیصلہ ہونے تک انتظار کریں اب تھوڑے ہی

دنوں کی بات ہے۔ انہوں نے پہلے جو کچھ بھجوایا تھا ابھی اس کی تصحیح بھی مکمل نہیں کر سکا۔ آج کل اس گومگو میں کہ نہ جانے کیا فیصلہ ہوگا کوئی ٹھوس کام کرنا مشکل ہے تاہم اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لئے کچھ اشعار[1] گڑھے تھے وہ بھیج رہا ہوں۔ میرے خیال میں ایسے بُرے نہیں ہیں۔ ہمایوں کو بھیجنے کا ارادہ تھا لیکن جیسے تمہارا جی چاہے کرو۔

یہاں پچھلے چند دن سخت سردی پڑی لیکن اب یہ لہر گزر گئی ہے اور موسم خوشگوار ہوگیا ہے۔ لاہور کا درجۂ حرارت دیکھتا ہوں تو جھرجھری سی آجاتی ہے اور اس خیال سے کہ اس غضب کی ٹھنڈک اور تنہائی میں تم پر اور بچّوں پر کیا گزر رہی ہوگی۔ دل دُکھتا ہے لیکن یہ بھی اُسی طرح گزر جائے گا جیسے اور بہت کچھ گزر چکا ہے۔ آج کل نہ پیچھے کی طرف دیکھنا چاہئے اور نہ دائیں بائیں۔ صرف سامنے مستقبل پر نظر جمائے رکھنا چاہئے تاکہ ہمارے سر ہاتھ اور تنہا آنکھیں اس سورج کی گرمی اور ملائمت محسوس کر سکیں جو کل ملاقات کی صبح میں طلوع ہوگا جب رات بیت چکی ہوگی اور بادل چھٹ چکے ہوں گے یہ کل اور یہ صبح کوئی ہم سے چھین نہیں سکتا اس لئے مسکراؤ اور روشن اور پُر اُمید دل سے نئے سال کا خیر مقدم کرو۔

۶۸

۲ / جنوری ۱۹۵۳ء

کل تمہیں یہ لکھنے بیٹھا تھا کہ نیا سال تمہیں زیادہ خوشی کے دن دکھائے لیکن بار بار اُس بارِ غم کا خیال آتا رہا جو اُس دن طفیل کی میّت کے ساتھ لاہور کی جانب رواں تھا اور میں نے لکھنا چھوڑ دیا۔ دو روز طوفانِ باد و باراں کے بعد (چھ مہینے میں یہاں یہ پہلی بارش تھی) دھوپ نکلی تھی اور بہت روشن اور درخشاں دن تھا جسے سب لوگوں نے نیک شگون سمجھا۔ میں تمام صبح انتظار میں بیٹھا رہا یہ جانے بغیر کہ کس چیز کا انتظار ہے اور پھر تمہارا اور بچّوں کا سوچتا رہا۔ پھر وہ سب میٹھی اور غمگین باتیں یاد

---

[1] غزل۔ یادِ غزال چشماں، ذکرِ سمن عذاراں۔

آئیں جن سے میری زندگی کے شب و روز عبارت ہیں۔ تمہاری ماں اور اپنی ماں کے بارے میں سوچا جو دونوں اپنے اپنے غموں سے نڈھال ہیں۔ ان لکھوکھا ماؤں بیویوں اور بچوں کا سوچا جو اس نوزاد آسمان کو تک رہے ہیں۔ اور اس تلاش میں ہیں کہ اس میں کہیں ان کے سفاک درد و غم سے نجات کی کوئی نشانی یا کوئی اشارہ موجود ہو۔ پھر مجھے پشکن کی خوبصورت دعا یاد آئی۔" اے خدا لوگوں کی راہوں پر رحمت کر" اور دل محبت اور تقدیس سے کچھ اس طرح لبریز محسوس ہوا کہ چین آ گیا۔

سہ پہر میں دست صبا کی تقریب منانے کے لئے (کتاب ہم نے ابھی تک نہیں دیکھی) ساتھیوں نے میری چائے کی دعوت کی (پھولوں کے ہار وغیرہ وغیرہ سمیت) کتنی اچھی اور پیاری بات تھی۔ پھر اصل اچنبھے کی بات ہوئی۔ جیلر نے مجھ سے آ کر کہا آپ کی "ملاقات آئی ہے"۔ یہ آمنہ تھیں جو حسب معمول تحفوں کا انبار ساتھ لائی تھیں۔ اتنی خوشی ہوئی کہ قریب قریب رونا آ گیا۔ ہم اتنی گرم جوشی سے ملے کہ دیکھنے والوں کو ہمارے بھائی بہن ہونے میں شبہ ہونے لگا ہوگا۔ کل وہ تم سے ملنے لاہور جا رہی ہیں اور شاید اس خط کے ساتھ ہی وہاں پہنچیں گی۔ چنانچہ اگلے کچھ دن یہاں کے فیصلے کے انتظار تک ان کا ہمارا ساتھ رہے گا۔ فیصلہ اب آج کل ہی کی بات ہے۔

یہ سن کر دل بہت متاثر بھی ہوا اور بہت مطمئن بھی کہ بالی کے میاں[2] نے بہتیں تحفہ[3] بھجوایا ہے۔ مجھے شبہ تھا کہ شاید دوستی کا رشتہ ہمارے حالات کا بوجھ برداشت نہ کر سکے۔ بہت اچھا ہوا کہ یوں نہیں ہے۔

۶۹

۵ / جنوری ۱۹۵۳ء

اب تک بری[4] خبر تمہیں پہنچ چکی ہوگی۔ اس سے اپنا دل زیادہ پریشان نہ ہونے دو۔

---

[1] یہ جیل کی خاص اصطلاح ہے۔ [2] پطرس بخاری۔ خط میں عمداً اُن کا نام نہیں لکھا گیا تھا۔
[3] پانچ سو روپے۔ [4] مقدمے کا فیصلہ۔

جیسے ہم نے پچھلے دو سال گزار لیئے یہ بھی گزار لیں گے۔ اصل میں کوئی مصیبت اتنی بری نہیں ہوتی جیسی کہ بظاہر نظر آتی ہے اور جب گزر جائے تو بہت عجیب لگتا ہے کہ ہم اس کے بارے میں اتنے ہراساں کیوں تھے۔ ذرا سوچو تو اس نئی مصیبت کے آخر کیا معنی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ڈھائی سال کی مزید جدائی۔ اگر تم گرد و پیش نگاہ دوڑاؤ تو ہندوستان پاکستان میں تمہیں شاید ہی کوئی نیک آدمی ایسا ملے گا جس نے برطانوی عہد میں اس سے زیادہ جیل نہ کاٹی ہو اور کسی کا کچھ بھی نہیں بگڑا۔ بدقسمتی سے نیکی اور نجات کی کوئی سہل راہ نہیں ہے۔ اس راہ میں ہم سے جو مطالبہ کیا گیا ہے وہ کسی طرح غیر معمولی نہیں ہے۔

۶ / جنوری :۔ مجھے افسوس ہے کہ کل کے واقعہ کی گھما گھمی میں یہ خط ختم نہ ہو سکا۔ ابھی سے کل کے واقعات بالکل مہمل اور دل سے دور معلوم ہونے لگے ہیں۔ حقیقی اور با معنی بات صرف اتنی ہے کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا، کوئی گناہ نہیں کیا اور میرا دل بالکل مطمئن اور پُرسکون ہے آج صبح ہمارے ساتھی اسی بات کی شکایت کر رہے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ کل رات نو بجے کے قریب جب وہ میرے ہاں سے اٹھ کر گئے تو بس دس منٹ کے اندر میں سو گیا اور خرّاٹے لینے لگا۔ جس سے اُن کی نیند خراب ہوئی۔ ضرور ایسا ہی ہوا ہوگا اس لیئے کہ صبح جب میری آنکھ کھلی تو کمرے میں دھوپ آ چکی تھی۔ اچانک میں نے سوچا کہ کل ہوا کیا تھا اور اس ساری خرافات پر ہنسی آنے لگی۔ پھر ہم فلسفہ چھانٹنے لگے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ ایک آدمی جو زندہ اور صحت مند ہے کیسا بھی غمگین اور درد مند کیوں نہ ہو اُس شخص سے بہر صورت بہتر ہے جو زندہ ہے لیکن بیمار ہے۔

اور وہ شخص جو زندہ اور بیمار ہے لیکن اُسے صحتیاب ہونے کی اُمید ہے اس شخص سے بہتر ہے جو زندہ اور بیمار ہے لیکن شفا سے نا اُمید۔

اور آخری شخص اس شخص سے بہتر ہے جو کہ مر چکا ہے۔

اور جو مر چکا ہے وہ تو کوئی شخص ہی نہیں اس لیئے وہ نہ کسی سے بہتر ہے اور نہ

بد تر۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص بھی زندہ ہے وہ کسی نہ کسی سے بہتر ہے اس لئے اُسے شکایت کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اس سے مجھے گرمانی کا وہ قصّہ یاد آ گیا جس میں "دو صورتیں ہیں" کی تکرار ہے اور پھر مجھے ہنسی آ گئی۔ اگر تم سمجھتی ہو کہ بہت وزنی اور سنجیدہ معاملات کے بارے میں ہمارا رویّہ قطعی غیر سنجیدہ ہے تو ہم معافی چاہتے ہیں لیکن یہ معاملہ ہے ہی اس قدر واہیات۔ مجھے اس کا پورا احساس ہے کہ تمہارے لئے یہ کوئی ہنسی کی بات نہیں ہے اور تمہارے تھکے ہوئے کاندھوں پر لمبے عرصے کے لئے مزید بوجھ لاد دیا گیا ہے۔ لیکن اپنا دل مضبوط رکھو اور ان لوگوں کے بارے میں سوچو جو تم سے کہیں زیادہ کم نصیب ہیں۔ یہ امتحان کیسا ہی سخت کیوں نہ ہو آخر گزر جائے گا۔ تم اس کا سوچو کہ جس دن یہ ختم ہو گا وہ دن کیسا عمدہ ہو گا۔ بہر حال مجھے یقین ہے کہ صورتِ حال

لہ نواب مشتاق احمد خاں تقسیم سے پہلے برطانوی ہند میں افرادی طاقت کے محکمے کے ڈائرکٹر تھے۔ دو صورتیں والا قصّہ انہوں نے اس طرح سنایا۔ پچھلی جنگِ عظیم (۱۹۳۹ء – ۱۹۴۴ء) میں فوجی بھرتی کا کام ہو رہا تھا۔ بھرتی کرنے والے افسر اور بھرتی ہونے والے اُمیدواروں میں سے ایک کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی۔ افسر نے اُس اُمیدوار سے کہا "اگر تم بھرتی کر لئے گئے تو دو صورتیں ہوں گی۔ ایک تو یہ کہ اپنے ہی وطن یعنی ہندوستان میں تمہیں رکھا جائے دوسری صورت یہ ہے کہ تمہیں پردیس بھیجا جائے۔ اپنے ملک میں رکھے گئے تو ٹھیک ہے کوئی فکر کی بات نہیں۔ اور جو کسی اور ملک بھیجے گئے تو پھر دو صورتیں ہوں گی۔ ایک تو یہ کہ ایسے ملک بھیجے جاؤ جہاں بالکل امن ہو۔ دوسری صورت یہ کہ وہاں بھیجے جاؤ جہاں جنگ ہو رہی ہے۔ اگر تم ایسے ملک بھیجے گئے جہاں امن و امان ہے تو یہ تو ٹھیک ہے اور جو جنگ والے علاقے میں بھیجے گئے تو پھر دو صورتیں ہوں گی۔ ایک یہ کہ تمہیں ہیڈ کوارٹر ہی میں رکھا جائے۔ دوسری صورت یہ کہ محاذِ جنگ پر بھیجا جائے۔ ہیڈ کوارٹر میں رکھے گئے تو ٹھیک ہے اور جو محاذِ جنگ پر بھیجے گئے تو پھر دو صورتیں ہوں گی۔ ایک صورت یہ کہ دشمن سے مقابلہ ہی نہ ہو اور دوسری صورت یہ کہ مقابلہ ہو جائے۔ مقابلہ نہ ہوا تو ٹھیک ہے اور جو مقابلہ ہو گیا تو پھر دو صورتیں ہوں گی۔ ایک صورت یہ کہ

جیسی بُری نظر آتی ہے ویسی ثابت نہیں ہوگی۔ مجھے خوشی ہے کہ نصیر[1] تمہارے پاس آگیا ہے امید ہے کہ وہ کافی دنوں تک تمہارے پاس رہے گا۔ کل آمنہ کا تار بھی آیا تھا جس سے مزید تقویت ہوئی۔ صرف اپنی دُکھیا ماں کے خیال سے دل دہلتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم اور آمنہ دونوں اُن کی کچھ دلجوئی کر سکوگی اور انہیں منوا سکوگی کہ زیادہ پریشان نہ ہوں آخر میں سب حالات سدھر جائیں گے۔ میری طرف سے ان سے درخواست کرو کہ میری وجہ سے انہیں جتنا دکھ پہنچا ہے اس کے لئے مجھے معاف کر دیں۔ میرے ضمیر پر اگر کوئی بوجھ یا گناہ کا احساس ہے تو صرف یہی ہے۔

۷۰

۱۲ر جنوری ۱۹۵۳ء

کل تمہیں تار بھیجا تھا۔ اور اُس کے بعد ہی کتابیں پہنچ گئیں۔ چھ عدد۔ اپنے جیل کی تخلیق دیکھ کر دل خوش ہوا۔ اس کی پیدائش میں بہت سا دُکھ شامل تھا۔ اور بہت سی اُمید بھی۔ چغتائی صاحب کو بہت عمدہ سرورق کے لئے میرا شکریہ پہنچا دینا۔ اور رؤف کو بھی کہ انہوں نے کتاب اچھی چھاپی۔ صرف ایک نقص ہے۔ کتابت کی کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں اتنی مختصر کتاب میں یہ غلطیاں نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ میں نے پروف میں جو تصحیح کی تھی وہ بھی نہیں ہوئی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اب اس بارے میں کچھ ہو سکتا ہے یا نہیں۔ رؤف کو چاہئے کہ جو نسخے ابھی بکے نہیں ہیں ان میں خود تصحیح کر دیں اور عام پڑھنے والوں کے لئے امروز اور لوائے وقت میں ایک صحت نامہ چھپوا دیں۔ میں نے پہلی نظر میں جو غلطیاں

دشمن کو مار ڈالو۔ دوسری صورت یہ کہ دشمن تمہیں مار ڈالے۔ اگر تم نے دشمن کو مار ڈالا تو ٹھیک ہے اور اگر دشمن نے تمہیں مار ڈالا تو پھر دو صورتیں ہوں گی۔ ایک صورت یہ کہ تم جنّت میں داخل ہو جاؤ۔ دوسری صورت یہ کہ جہنم واصل کر دیئے جاؤ۔ جنّت بھیجے گئے تو ٹھیک ہے اور جو جہنم بھیجے گئے تو وہ جہنم کسی طرح فوجی بھرتی کے اس دفتر سے تو بری نہ ہوگی۔

[1] نصیر احمد خاں۔ فیضؔ کے بھانجے۔

دیکھی ہیں ان کی فہرست بھیج رہا ہوں۔ ممکن ہے کچھ اور بھی ہوں۔ تم نے لکھا ہے کہ آپ لوگ دوسرے ایڈیشن کی تیاری کر رہے ہیں اس کا کیا مطلب ہے؟ اگر کتاب بہت بک رہی ہے تو ہمیں بھی لکھو تاکہ دل خوش ہو۔ تم نے انگریزی میں تبصرہ کرنے والوں کے نام پوچھے ہیں تاثیر کے انتقال اور بخاری کے پردیش چلے جانے کے بعد مجھے تو کوئی سوجھتا ہی نہیں۔ خواجہ[1] منظور ہیں لیکن وہ اتنے سست ہیں کہ لکھیں گے نہیں۔ پہلا زمانہ ہوتا تو آغا حمید سے کہہ سکتے تھے لیکن آج کل اس کا سوال پیدا نہیں ہوتا اس لئے آفتاب[2] سے پوچھ لو یا اُن سے کہو کہ کوئی نام تجویز کریں۔

نہ جانے تم اس نئی افتاد سے کیسے نبٹ رہی ہو۔ میرا خیال تھا کہ پہلے ہنگامی ردِعمل کے بعد ویران اور تنہا دنوں کے طویل سلسلے کے خیال سے اپنا دل ضرور پژمردہ ہو گا۔ لیکن ابھی تک ایسا کوئی احساس نہیں ہوا۔ اس کے خلاف جو بھی دن گزرتا ہے اپنا ذہن کچھ زیادہ باآرام، متوازن اور پُرسکون معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب مستقبل کے بارے میں کوئی بے یقینی باقی نہیں رہی۔ منزل مقرر ہو چکی ہے اس لیے ہر بیتتے ہوئے دن سے فاصلہ ایک قدم کم رہ جاتا ہے۔ مثال کے طور سے پرسوں ایک ہفتہ پورا ہو جائے گا۔ (سزا کی میعاد کا ایک ہفتہ) اور تین ہفتے کے بعد ایک مہینہ گزر چکا ہو گا۔ میں نے اس کا حساب یوں لگایا ہے کہ اگر کوئی رعایت نہ بھی ہو اور پوری میعاد (قیدِ بامشقّت میں عام طور سے ہر سال مشقت کے عوض چند ہفتے معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ جیل کے سالانہ معائنے پر بھی کچھ رعایت ملتی ہے۔) کاٹنی پڑے تو بھی تیس مہینے بنتے ہیں۔ یعنی ایک سو بیس ہفتے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ پرسوں صرف ایک سو انیس ہفتے باقی رہ جائیں گے اور بات ابھی شروع بھی نہیں ہوئی ہے میں نے اپنے لیے اتنا کام تجویز کر رکھا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا اس مختصر عرصے میں اسے پورا کیسے کریں گے۔ تم یہ سمجھ لو کہ ہم بھیک[3]

---

[1] خواجہ منظور حسین سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور۔ [2] ڈاکٹر آفتاب احمد خاں سابق استاد گورنمنٹ کالج لاہور۔ ملٹری اکاؤنٹس سروس سے وابستہ۔

[3] ڈاکٹر غلام بھیک۔ فیض کے دوست۔

کی طرح ایف۔ آر۔ سی۔ ایس کرنے چلے گئے ہیں یا کسی اور دوست کی طرح ڈاکٹریٹ کا تھیسس لکھ رہے ہیں یہ کام ختم ہو چکے گا تو واپس آجائیں گے صرف ندامت اس بات پر ہے کہ ہم یہاں آرام سے بیکار بیٹھے ہیں۔ اور تم پر اپنی اور بچوں کے لئے روزی حاصل کرنے کی ذمہ داری ہے۔ جو مردوں کا کام ہے اور اچھے مرد یہ کام عورتوں پر نہیں چھوڑا کرتے۔ یہ خیال آتا ہے تو ندامت سے پسینہ آجاتا ہے لیکن کہ ہی کیا سکتے ہیں۔

موجودہ صورت یہ ہے کہ اپیلیں دائر ہونے تک ہم لوگ یہیں رہیں گے۔ یعنی اگلے ماہ تک۔ اور پھر شاید ہمیں گھر سے کہیں قریب لے جائیں اس لئے اگلی ملاقات اس وقت تک اٹھا رکھو جب ہمیں اپنا ٹھکانہ معلوم ہو جائے اپنا دل مضبوط اور اپنا سر بلند رکھو اس لئے کہ کل ہمارا ہے۔ مجبوری کے عالم میں تلخی اور غم و غصہ سب بیکار باتیں ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ اپنی سب صلاحیتیں زیادہ مفید اور تعمیری کاموں کے لئے محفوظ رہیں۔

۱۷

۱۶ر جنوری ۱۹۵۳ء

تمہیں غالباً یہ پوچھنے کی فکر ہو گی کہ نئی صورت حال میں ہماری خط و کتابت کا کیا قاعدہ ہو گا۔ تمہاری پریشانی دور کرنے کے لئے مجھے سب سے پہلے اسی بارے میں لکھنا چاہیے تھا۔ لیکن جب لکھنے بیٹھو اتنا کچھ لکھنے کو ہوتا ہے کہ بہت سی باتیں ذہن سے اتر جاتی ہیں ہماری بود و باش کے سب طور طریقے قریب قریب وہی ہیں جو اب سے پہلے تھے اس لئے پریشانی کی کوئی وجہ نہیں اور تم پہلے کی طرح خط و کتابت جاری رکھو۔

میں نے گزشتہ خط میں لکھا تھا کہ سفر کے اخراجات کے پیش نظر ہمارے کسی اور جگہ منتقل ہونے تک تم ملاقات ملتوی کر دو۔ معلوم ہوتا ہے اس میں ابھی دو ماہ اور لگ جائیں گے جو زیادہ ہی لمبا عرصہ ہے اس کے علاوہ ایک دوسرے کو دیکھ لینے سے کچھ تشفی بھی ہو جائے گی اور ہم یہ نیا بوجھ زیادہ دلجمعی سے برداشت کر سکیں گے اس لئے اگر سفر خرچ کے پیسے ہیں تو تم ہی آجاؤ مجھ سے ملنے میں کوئی دقت

نہیں ہوگی اگرچہ اب ملاقاتوں کی تعداد شاید کم کردی جائے۔ جو لوگ ہم سے پہلے مل چکے ہیں وہ اَب بھی ویسے ہی مل سکتے ہیں۔ خاص اجازت توصرف اُن ملاقاتیوں کے لیے درکار ہے جو پہلے یہاں نہیں آئے۔ اس میں بھی کوئی ایسی دقت نہیں صرف کچھ پہلے سے اطلاع ہونی چاہیئے۔ لیکن غالباً اب تو یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں جو لوگ اب تک مل چکے ہیں ان کے علاوہ اب شاید ہی کسی کو یہاں آنے میں دلچسپی ہو۔

جیسے میں نے لکھا تھا میں نے تو نئے حالات سے پوری طرح سمجھوتہ کرلیا ہے۔ صرف تم لوگوں کی خیروعافیت کے بارے میں کبھی دل کو پریشانی ہوتی ہے لیکن تمہاری ہمّت اور بہادری کا سوچ کر اپنے دل کو تسلّی دے لیتا ہوں۔ اگرچہ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس بہادری سے جسم وجاں پر کیا گزرتی ہے۔ ایسے حالات میں دَردِ دل کی کچھ رعایت بھی ملحوظ رکھنی چاہیئے اور اپنے غم کے سامنے سر جھکانے پر نادم نہ ہونا چاہیئے۔ البتہ تحمّل اور برداشت کے پُل صراط پر قدم میں کوئی لغزش نہیں آنی چاہیئے اور دنیا والوں کے سامنے سر نہیں جھکنا چاہیئے۔

میں آج کل ایک بہت وحشت ناک کتاب پڑھ رہا ہوں Upton sinclair کا ناول The jungle ـ اس میں شکاگو کے فلاکت زدہ محلّوں میں بسنے والے مزدوروں کی جدوجہد بیان کی گئی ہے اسے پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ نکبت اور بدبختی کا یہ عالم تو ہمارے ہاں بھی نہیں۔ ان کے مقابلے میں اپنی تکالیف بچوں کا کھیل معلوم ہوتی ہیں۔ آجکل میں نے کئی طرح کے کام شروع کررکھے ہیں جو تسلّی بخش طریقے سے ہو رہے ہیں۔ میں نے فرانسیسی بھی دوبارہ شروع کردی ہے۔ اَب جب تم آؤ ہمارے اُستاد[۱] سے ایک فارسی لغت لیتی آنا اور حفیظ ہوشیارپوری سے کہنا کہ عروض پر ایک آدھ کتاب عاریتاً بھجوادیں۔

۴۲

۱۷ر جنوری ۱۹۵۳ء

فیصلے کے بعد یہ میرا چوتھا خط ہے اس لیے ہم تم سے کافی آگے ہیں۔ تم نے

---

[۱] صوفی تبسّم۔

خط میں جو کچھ لکھا ہے اور جس پیرائے میں لکھا ہے اُسے پڑھ کر بہت خوشی ہوئی اور اگر تشویش یا پریشانی کا کوئی شائبہ دل میں تھا بھی تو اب نہیں رہا۔ سب آزمائشوں کے باوجود زندگی ایسی خوش آئند معلوم ہوتی ہے کہ صبح اٹھتا ہوں تو بے وجہ گانے کو جی چاہتا ہے اس میں بہت کچھ تمہارا بھی حصّہ ہے جس کے لئے شکر گزار ہوں۔

یہاں کوئی بات لکھنے کو نہیں ہے اور اب کچھ کرنے کو بھی نہیں ہے۔ بجز اسکے کہ نجات اور ملاقات کے دن کا انتظار کریں۔ اب اس بارے میں کوئی بے یقینی باقی نہیں اس لئے انتظار کے دن برابر بیتے جا رہے ہیں۔ ہر دن جو گزرتا ہے اور ہر رات جو ختم ہوتی ہے ماضی میں دفن ہو جاتی ہے صرف آنے والا دن زندہ ہے۔ اس کی اُمید اور گیت زندہ ہیں۔ صرف اُسی کا سوچنا چاہیئے اور اس کی آمد کے جشن کی تیاری کرنی چاہیئے۔

سردیوں کا موسم گزر چکا ہے اور آج کل یہاں بالکل وسطِ بہار کا موسم ہے۔ ہمارا باغیچہ رنگوں سے دہک رہا ہے اور آج کل ہم ایک نیا باغ لگانے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ اگرچہ اس کی بہار شاید ہم نہ دیکھ سکیں۔

۴۳

۲۹ جنوری ۱۹۵۳ء

دیکھو تو دو ہفتے گزر بھی گئے (اب صرف ایک سو اٹھارہ باقی ہیں) اور دن بہت تیزی سے نہ سہی لیکن پھر بھی مستقل اور بدستور گزرتے جا رہے ہیں تمہیں شاید کوہ پیمائی کا قاعدہ معلوم ہو۔ وہ یہ ہے کہ اگر چڑھائی سخت اور طویل ہو تو صرف اگلے قدم کو دیکھنا چاہیئے اور جس چوٹی تک پہنچنا ہے اُدھر نگاہ نہ کرنی چاہیئے۔ ورنہ جب تک وہاں پہنچ نہ جائیں وہ ہمیشہ اتنی دور دکھائی دے گی کہ حوصلہ ہار دینے کو جی چاہے گا۔ صرف ایک قدم اور اس کے بعد اگلے قدم پر توجہ ملحوظ رکھو تو اچنبھا ہوگا کہ فاصلہ اتنی جلد کیسے کٹ گیا۔ اس یکسوئی کی وجہ سے خوف اور بددلی سے بھی نجات ہو جاتی ہے۔ تم نے پوچھا ہے کہ اس دوران میں عمر اور وقت اپنی جوانی

اور شکل و صورت پر جو غضب ڈھائیں گے اس کا صلہ کیا ہے۔ ایک بڑی حقیقت جو میں نے یہاں دریافت کی ہے یہ ہے کہ اپنی عمر اور شکل و صورت صرف اجنبی اور بیگانہ لوگوں کے لئے اہمیت رکھتے ہیں اور جس عمر میں بیگانے اِدھر توجہ دینے لگتے ہیں اس عمر میں آپ بیگانوں سے دلچسپی لینا چھوڑ دیتے ہیں جیسے جیسے اجنبی دنیا سے تعلقات کا دائرہ تنگ ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے اپنی نجی دنیا کے رشتے زیادہ گہرے زیادہ مکمّل اور زیادہ آسودہ ہوتے ہی جاتے ہیں جس طرح ہر روز سماجی دنیا بتدریج زیادہ بیگانہ ہوتی جاتی ہے۔اسی انداز سے ہر روز اپنے عزیز عزیز تر ہوتے جاتے ہیں اس لئے کہ محبت اور دوستی کا صرف یہی ایک سرمایہ اپنے پاس رہ جاتا ہے۔ اور جذباتی آسودگی کے لئے اسی خزینے پر تکیہ کرنا پڑتا ہے۔ فطرت کے نظام میں جوانی کی دولت سے محرومی کا صلہ یہی ہے کہ بیتے ہوئے دلوں سے جو کچھ ورثے میں ملتا ہے اس کا شعور اور اس کی قدر پہلے سے کہیں زیادہ ہو جاتی ہے جب براؤننگ نے لکھا تھا کہ بڑھاپے تک میرے ساتھ چلو۔ تو یقیناً ذاتی تعلقات کی یہی گہرائی اور استواری اس کے ذہن میں ہوگی جو صرف عمر کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔ مجھے تو اَب یہ گمان ہونے لگا ہے کہ صحیح محبّت اور دوستی سن رسیدہ ہونے سے پہلے ممکن ہی نہیں۔ یہ رشتے ان ہی لوگوں کے مابین ممکن ہیں جو جوانی کے لہو و لعب کو پیچھے چھوڑ چکے ہوں۔ جب طرح طرح کے دلکش چھلاوے دامنِ دل کھینچتے ہیں۔ جوانی کی عاشقی تو سب مایا ہے۔ سب فریب نظر ہے اگرچہ ہر فریب نظر حسین بھی ہوتا ہے اس لئے قابلِ قدر بھی۔ شاید تمہیں ہماری عقل و حکمت پر ہنسی آرہی ہوگی اس لئے بس کرتے ہیں۔

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ یہاں ہمارے رہن سہن کے بارے میں کسی پریشانی کی ضرورت نہیں، اس میں کچھ خاص فرق نہیں آیا سوائے اس کے کہ میل ملاپ میں کچھ کمی کرنی پڑے گی جو ہمیں پہلے بھی کچھ زیادہ نصیب نہیں تھی۔

تم نے سرکاری مراسلوں کی بوالعجبیوں کا ذکر کیا ہے اس سے دل میلا نہ کرنا چاہیئے۔ اوّل تو مُراسلہ نویسوں کا معیارِ لیاقت تمہیں معلوم ہے دوسرے ہم مشرقی لوگ لکھتے وقت الفاظ پر کچھ زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ میری مراد ہے اپنے الفاظ پر۔

ہم صرف دوسرے فریق کے الفاظ میں میخ نکالتے رہتے ہیں۔

۴۷

۲۸ جنوری ۱۹۵۳ء

دو دن ہوئے میں صبح بیدار ہوا تو صبح کی ہوا میں ایک نئی ملائمیت محسوس ہوئی بادِ بہار کی مانوس اور جانی پہچانی نرمی۔ میں ڈریسنگ گون پہنے بغیر باہر نکلا اور صبح نے اس تاثر کی توثیق کی کہ واقعی بہار آچکی ہے اس لئے کہ صبح کی رنگت بدل چکی تھی۔ یہ صرف درجۂ حرارت کی بات نہیں ہے۔ روشنی، رنگ اور فضا کی کیفیت سب کچھ بدل جاتا ہے جب بھی موسم بدلتا ہے ہر نئے دن میں کچھ دھڑکن سی، کچھ ارتعاش سا، کچھ بے یقینی سی پائی جاتی ہے جو اُس وقت تک رہتی ہے جب تک کہ اگلا موسم یعنی گرمی یا سردی کا موسم آکر جم نہیں جاتا۔ کچھ ہیجان آفرینی تو موسم کی ہر تبدیلی میں ہوتی ہے لیکن اسیری کے دنوں سے پہلے اس کا اتنی شدّت سے کبھی احساس نہیں ہوا تھا غالباً اُن دنوں اس کی فرصت ہی نہ تھی۔ نہ دل و دماغ اتنے فارغ تھے کہ ایسے محرّکات سے زیادہ متاثر ہو سکیں۔

فیصلے کے بعد میں نے اب تک کچھ بھی نہیں لکھا۔ مستقبل کے بارے میں بے یقینی اور اس سے متعلق وسوسے دور ہو جانے سے سکون اور طمانیت کی ایسی لہر دل میں اٹھی کہ اس کی غنودگی سے اب کچھ بیدار ہونے لگے ہیں۔ اور اب جو بہار آئی ہے تو سازِ سخن میں کچھ موہوم سی لرزشیں بھی محسوس ہونے لگی ہیں۔ میں بہار کے نام ایک سلام لکھنا چاہتا ہوں اور زندگی اور امید اور محبّت کے نام بھی جن کا ہر بار نیا جنم لینا ایسا ہی ابدی عمل ہے جیسا کہ خزاں کی غارت گری۔ ان دلوں کے نام بھی جو غم سے دھل کر مصفّا ہو جاتے ہیں اور ہر نئی کلی کے نام بھی جو بے دھڑک فنا اور نیستی کو للکارتی ہے۔ جی چاہا تھا کہ کراچی کے طلبہ کے لئے بھی کچھ لکھوں لیکن اس خیال سے نہیں لکھا کہ شاید میں اُن سے پورا انصاف نہ کر سکوں یوں بھی ایسی نظم میں اسی موضوع کی تکرار ہوگی جو میں ایرانی طلبہ کے بارے میں لکھ چکا ہوں یہ میری سب سے اچھی نظموں میں سے ایک ہے۔ اور میں نہیں چاہتا کہ اپنے بچّوں کو اس سے کم درجے کی چیز پیش کر دوں۔ شاید بعد میں کبھی کسی اور موقع پر انہیں خراج ادا کر سکوں گا۔

اصل میں اب اس طرح کی چھوٹی موٹی چیزیں لکھنے کو جی نہیں چاہتا کچھ اعتماد پیدا ہو جائے تو ارادہ ہے کہ پرانی رزمیہ نظموں کے پیمانے پر کوئی بڑی چیز لکھوں جس میں اپنے دور کی عظیم الشان کشمکش حیات کا بیان ہو سکے اس لیے کہ ہمارا دور شاید تاریخ کا سب سے شجاعانہ اور ولولہ انگیز دور ہے نہ جانے یہ کبھی لکھا جا سکے گا کہ نہیں۔ لیکن ارادہ ضرور ہے۔

۷۵

۴ر فروری ۱۹۵۳ء

پہلے کاروباری باتیں ختم کریں۔ میں نے عدالت سے درخواست کی ہے کہ منظور قادر اور محمود علی قصوری کو میری اپیل تیار کرنے کی اجازت دی جائے۔ افتی[1] سے کہو کہ مہربانی سے دونوں کو مطلع کر دیں نقشِ فریادی کے بارے میں قانونی کاغذات پُر کر کے بھجوا دیئے ہیں۔ دستِ صبا کا نیا ایڈیشن کب نکلے گا؟ پہننے کی چیزوں کی پڑتال کر لی ہے۔ درجن کے قریب پاجامے ہیں اور نئے کُرتے سِل کر آجائیں تو کُرتے بھی درجن بھر ہو جائیں گے۔ اگر تمہیں پیسے لٹانے پر اصرار ہے تو ایک معمولی پتلون اور از قسم چپّل کوئی چیز بھجوا دو۔ بیسیوں کی مجھے ضرورت نہیں۔

جو کتابیں میں نے منگوائی تھیں وہ عام حوالے کی کتابیں ہیں یعنی کوئی فارسی اردو لغت اور عروض پر کوئی سی کتاب جو نام تم نے لکھا ہے وہ یا ویسی ہی کوئی اور۔

اب یہاں بہار عروج پر ہے اور یہاں کی اہم خبر صرف یہ ہے کہ ہمارے ہالی ہاک پودوں میں پھول کھل گئے ہیں۔ ایسے پھول کبھی پہلے دیکھنے ہی میں نہیں آئے۔ کم از کم اس افراط میں نہیں، دھندلے پیازی، ہلکے گلابی، نیلے جن میں سنہری دھاریاں ہیں اور آتشیں بھڑکیلے سُرخ رنگوں کا طوفان بپا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ تمہیں بھی یہ پھول بھیجوں لیکن یہ بہت بڑے ہیں۔ ان کے بجائے سرسوں کی ایک کونپل بھیج رہا ہوں جو بہار کی علامت ہے یہ اتنی نازک ہے کہ شاید تم تک نہ پہنچ سکے لیکن وہ خیال جو اس کے

---

[1] میاں افتخار الدین مرحوم۔

ہمراہ ہے وہ تو پہنچ جانا چاہئے۔

دوسری نشاط انگیز بات نئی کتابیں ہیں۔ کچھ وکٹر[1] نے بھجی ہیں۔ کچھ اور لوگوں نے ابھی ابھی ایک پیٹ میں بل ڈال دینے والی کتاب ختم کی ہے۔ ایسی ظریفانہ اور مزاحیہ تصنیف بہت زمانے سے نہیں دیکھی۔ کتاب کا نام ہے The horse's mouth۔ مصنف Joyce carey ہیں۔ اور ہین گوئن نے چھاپی ہے۔ اگر کہیں سے حاصل کرسکو تو ضرور پڑھو۔ نئے لکھنے والوں میں بہت کم ایسے ہوں گے جنہیں فرنگی عوام کی روزمرّہ زبان اور اس کی چھوٹی چھوٹی باریکیوں پر اتنا عبور ہو۔

تو جانم آج فروری کی چار تاریخ ہے یعنی ایک مہینہ بھی گزر چکا اور وقت برابر گزر رہا ہے۔ دل بشاش اور مطمئن ہے اور میں تلاش بھی کرتا ہوں تو اس کی تہوں میں خوف و تشویش اور غم و غصّے کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ صرف زندگی کی اچھائی کے لئے احسان مندی کا احساس ہے۔

۷۶

۸ رفروری ۱۹۵۳ء

ایک اور ہفتہ ختم ہونے کو ہے اور یہاں ہوا کے بوجھل پن میں اور دھوپ کی تیزی میں موسم گرما کی تاثیر پیدا ہو چلی ہے گرما کو انگریزی میں Summer کہتے ہیں اور بہار کے لئے بھی یہی لفظ استعمال ہوتا ہے لیکن ہماری گرمیوں کو بہار کا موسم کہنا بالکل مضحکہ خیز بات ہے اور اس موسم کے خاتمے کو خزاں کہنا بھی بے تکا پن ہے۔ اصل میں بہار اور خزاں تو جذباتی اور رمزیہ الفاظ ہیں جن کا گرمی سردی سے بہت کم تعلق ہے۔ ان کا مفہوم تو ہے ستم روزگار اور اس سے نجات درد و غم کی ابتدا اور اس کا خاتمہ، دل جلانے کے دن اور پیار کرنے کے دن۔ سختی برداشت کرنے کا عزم اور سکھ کا سانس، آسائش، خوشحالی اور افلاس و محرومی۔ ہمارے ہاں تو بہار کا ایسا کوئی

---

[1] وکٹر گیرنز۔

موسم نہیں آتا ۔ صرف گرمی سردی کا موسم آتا ہے ۔ پھر مختلف لوگوں کے لئے موسم گرما کا پیغام بھی الگ الگ ہوتا ہے ۔ مثلاً یہ موسم قریب آئے گا تو تم اس کی آمد پر ہراساں ہوگی لیکن میں اس کا خوشنودی خاطر سے انتظار کر رہا ہوں ۔ وجہ یہ ہے کہ یہاں موسم کی ہر تبدیلی خوش آئند ہوتی ہے کبھی کبھار کسی عزیز چہرے کے دیدار کے سوا یہاں کی زندگی میں یہی واحد تبدیلی ہے جسے ہم جانتے ہیں اس کے علاوہ موسم تبدیل ہوتا ہے تو اور بہت سی چیزیں بدل جاتی ہیں ۔ زمین اور آسمان اور پیڑوں کی رنگت بدل جاتی ہے، رات کو سونے کی جگہ، پڑھنے، گپ کرنے اور سونے جاگنے کے اوقات، زندگی کا روزمرّہ معمول اور سوچ اور احساس کا پیرایہ سب کچھ بدل جاتا ہے اور اگر کسب لطف اور حیرتِ نگاہ کی حس باقی ہو تو یہ سب کچھ بہت عجیب اور بہت اچھا لگتا ہے، دل کو فرحت ہوتی ہے ۔

جیل خانے میں آدمی کتنا خود غرض ہو جاتا ہے میں ان لذّتوں کا ذکر کئے جا رہا ہوں حالانکہ مجھے معلوم ہے کہ تنہا محنت کش عورتوں کے لئے اور ہم جیسے تنگ دستوں کے بچّوں کے لئے اس موسم کے کیا معنی ہیں اور ان لوگوں کے لئے کیا معنی ہیں جو ہم سے بھی زیادہ تنہا اور محتاج ہیں ؛ اپنی مصیبت میں اُن کی مصیبت بھی شامل ہے ۔ اپنی تنہائی کے ساتھ ان کی تنہائی بھی لگی رہتی ہے اور دنیا بھر کی دُکھی ماؤں کا دکھ اور سب فرقت زدہ بیویوں اور محبوباؤں کا درد اور سب بچوں کے آنسو جنہیں ظالم ہاتھ ان کے اپنوں کے پاس جانے سے روکتے ہیں لیکن اُن کے درد کے ساتھ ان کی ہمت اور ان کا تحمّل بھی اپنے ساتھ لگا رہتا ہے ۔ یہ ایک دوسرے کی تلافی کرتے رہتے ہیں اس لئے دل ٹھوکر نہیں کھاتا ۔ تم اس بات سے رنجیدہ ہو کہ کسی نے تمہیں لارڈ کلایو اور وارن ہیسٹنگز کے جرائم کا طعنہ دیا یہ واقعی بہت تکلیف دہ اور دل دکھانے والی بات ہے لیکن قومی منافرت کا خاصہ ہے کہ وہ شئے پر محیط ہوتی ہے ۔ اور کوئی بھی شکار ہاتھ آ جائے خواہ وہ کیسا ہی معصوم اور بے گناہ کیوں نہ ہو اُسے ایذا پہنچانے سے نہیں چوکتی ۔ اسی لئے ایسی منافرت اور تعصّبات سے جنگ و پیکار ضروری ہے ۔ اسی سبب سے ہم نفرت اور تنگ نظری کے خلاف انسان دوستی اور اخوّت کی عالمگیر جدو جہد میں شامل ہیں جہاں تک طعنہ زنی اور

تہمت تراشی کا سوال ہے میرے اپنے ہم وطنوں میں بھی ایسے لوگ ہوں گے جو گزشتہ واقعات کے بعد مجھے بھی ایک خونخوار طالع آزما سمجھتے ہوں گے ایسے الزامات پر مجھے اکثر ہنسی آتی ہے یہ جانتے ہوئے کہ جو لوگ مجھ سے واقف ہیں ان کی نظر میں یہ تہمتیں بالکل بے معنی ہیں اور جو ناواقف ہیں ان کی رائے بالکل بے وقعت ہے۔ یہی بات تمہارے بارے میں بھی صحیح ہے "جو لوگ نہیں جانتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں"۔ اُن کے بارے میں وہی رویہ اختیار کرنا چاہیے[1] جو حضرت مسیح کا تھا۔ صرف اخلاق کی وجہ سے نہیں بلکہ عملی مصلحت کی خاطر یوں نہ کرو تو اپنا سکون واطمینان اُنہی بہتان طرازوں کے رحم وکرم پر ہوتا ہے۔ اور دنیا میں ایسے افراد کبھی کم نہیں ہوتے۔

تمہارے خط میں یہ پڑھ کر بہت ہنسی آئی کہ کسی نے ہمیں ہیرو کہا ہے۔ جیسا تم جانتی ہو۔ "ہیروپن" بالکل ہماری لائن نہیں ہے اپنے ماضی پر نظر دوڑاتا ہوں تو بہادری کا ایک بھی ایسا کارنامہ نظر نہیں آتا جو ہم نے سرانجام دیا ہو۔ بلکہ ہم نے تو کبھی اس کی کوشش ہی نہیں کی اور آج کل جو یہ شہرت یا عظمت مجھ پر ٹھونس دی گئی ہے اس میں بھی اپنا قصور نہیں ہے۔ میں نے تو یقیناً یہ نہیں چاہا تھا۔ ہم نے زندگی میں صرف ایک ہی بات کی کوشش کی ہے اور وہ یہ کہ اپنے مسلک پر ثابت قدم رہیں اپنی ذاتی نیک نیتی برقرار رکھیں اور کسی لالچ میں آکر اپنی دیانت کا سودا نہ کریں لیکن یہ ایک صفت تو ان گنت ہزاروں لاکھوں میں ہم سے کہیں زیادہ موجود ہے اس لئے کہ عوام کی اکثریت دیانت دار ہے چنانچہ یہ کوئی ایسی خوبی نہیں جسے کوئی اپنے سے مخصوص کر سکے۔

اپیل کے بارے میں یہ ہے کہ عدالت نے وکلا کو مہلت دینے سے انکار کر دیا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ یہاں کا انصاف اگر منصف نہیں ہے تو Consistent ضرور ہے۔ حمید نظامی اور شفیع کے بہت دوستانہ خط آئے ہیں جن کے لئے ان کا شکریہ ادا کر دینا۔ میں غالباً کچھ عرصے تک انہیں جواب نہ بھیج سکوں

---

[1] انجیل مقدس کا اقتباس۔

گا۔ میرے پڑھنے لکھنے کے منصوبوں سے تمہیں زیادہ گھبراہٹ نہ ہونی چاہئے ہم نے عمرِ عزیز میں جہالت کا اتنا سرمایہ جمع کر لیا ہے کہ اگلے چند ماہ میں اس سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں اور پھر کتابیں تو تجربے کا بدل نہیں ہیں اور تجربہ درد و محبت سے تمہیں حاصل ہو رہا ہے، ہیرو ہیروئن عمل اور تجربات پیدا کرتے ہیں محض الفاظ کی گردان سے کیا ہوتا ہے۔

آج کل میں کچھ نہیں لکھ رہا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ عروسِ سخن ہمیشہ کے لئے مفرور ہو گئی ہے لیکن یہ کوئی نئی حرکت نہیں اس لئے مجھے معلوم ہے کہ لوٹ آئے گی۔

۷۷

یکم مارچ ۱۹۵۳ء

اب کے تم نے بہت زندہ دلانہ خط لکھا۔ جس سے بہت خوشی ہوئی۔ اس کے علاوہ کل دن میں بھی بہت ہنگامہ رہا۔ صبح اطلاع آئی ایک صاحب ڈاکٹر امداد حسین ملاقات کے لئے آئے ہیں اور ہم ان سے ملنا چاہیں گے کہ نہیں یہ محکمۂ تعلیم میں ہیں اور میری ان سے واجبی سی واقفیت ہے۔ ایم اے، او کالج امرتسر میں میرے پیشرو تھے اس کے بعد کچھ عرصے کے لئے گورنمنٹ کالج میں تھے۔ اور پھر بیرونِ ملک مقیم رہے۔ چنانچہ ان کے آنے سے مجھے کچھ تعجب بھی ہوا کچھ خوشی بھی ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنی بیگم اور اپنی بیٹی سلمیٰ سمیت ملنے کے لئے آئے۔ یہ سلمیٰ[1] ہماری سلمیٰ[2] کی عمر کی ہے۔ بہت ہی پیاری سی بچّی ہے۔ باتوں میں پتہ چلا کہ اصل میں وہی ہماری قدر داں ہے اور اپنے والدین کو ساتھ کھینچ لائی ہے یہ سب بہت اچھا لگا اور ہم نے بہت احسان مند محسوس کیا۔ یہ لوگ کوئی بارہ بجے کے قریب رخصت ہوئے اور ایک گھنٹے بعد ملاقاتیوں کا ایک پورا قافلہ آ گیا ــــ سہروردی[3] تھے، اطہر[4] تھے، عارف[5] تھے اور ایک اور نوجوان جن سے کلکتے میں ملاقات

---

[1] یہ بچّی چند برس پہلے جوان عمر میں فوت ہو گئی [2] سلمیٰ تاثیر۔ شادی کے بعد بیگم محمود الٰہی۔
[3] حسین شہید سہروردی [4] علی اطہر وکیل [5] میاں افتخار الدّین مرحوم کے صاحبزادے عارف افتخار۔

ہوئی تھی جو امریکہ میں ہمارے سفیر[1] کے چھوٹے بھائی ہیں۔

یہ خط اس لئے ختم نہ ہو سکا کہ گورنر[2] صاحب جیل کے معائنے کے لئے تشریف لائے اور ہمارے قصر بلنگھم میں ہماری قیام گاہ میں بھی قدم رنجہ فرمایا اور رسمی باتیں ہوتی رہیں۔

میں مہروری صاحب اور پارٹی کا ذکر کر رہا تھا۔ اپیل کے بارے میں سب باتیں طے ہوگئی ہیں۔ اور تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ عارف سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ اس نے آتے ہی کینز کے نظریہ اور سلانسکی کے مقدمے اور نہ جانے کس کس چیز کے بارے میں سوالات شروع کر دیئے۔ کہنے لگا مجھے یہ سب کچھ تفصیل سے سمجھایئے اس لئے کہ مجھے اس بارے میں اپنے ایک بہت رجعت پسند رشتے دار سے بحث کرنی ہے اس نے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ میں نے پوچھا وہ کون ہے؟ بولا سہیل[3] اور کون۔

بہت خوشی ہے کہ تمہارا دوسرا ایڈیشن بہت مقبول ہوا۔ لیکن میں حیران ہوں کہ تم لوگ یہ کتابیں کس کے ہاتھ بیچ رہے ہو۔ اب سے دس برس پہلے تو دوسری بات تھی جب ہمیں معلوم تھا کہ کالج کی لڑکیوں میں ہمارے مستقل خریدار موجود ہیں لیکن ان کی جگہ اب کون نئے گاہک پیدا ہوگئے ہیں اور وہ ہماری خرافات کو کیا معنی پہناتے ہیں۔ یہ سب ہمیں نہیں معلوم۔ میں جانتا ہوں کہ عام لوگوں کی گرہ میں اتنا مال نہیں ہے کہ کتابوں پر ضائع کرتے پھریں۔ اگر اس کے باوجود ہماری کتابیں خریدتے ہیں تو خوشی کی بات ہے۔ تم نے تیسرے ایڈیشن میں اضافے کا پوچھا ہے۔ شاید میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ اس میں ایک آدھ نظم شامل کریں جو پہلے ایڈیشن کی طباعت کے بعد میں نے بھجوائی تھی۔ اس ایڈیشن میں قاسمی[4] صاحب کا مضمون خوشی سے شامل کر لو لیکن اس میں

---

[1] محمد علی بوگرہ [2] میاں امین الدین مرحوم جو ڈاکٹر تاثیر مرحوم کے رشتے کے بھائی تھے ان سے فیض کے خاندانی تعلقات تھے۔ [3] میاں افتخار الدین کے دوسرے صاحبزادے سہیل افتخار جو مئی ۱۹۷۱ء میں فوت ہوگئے۔

[4] احمد ندیم قاسمی۔

میری تصویر ٹھونسنے کی ضرورت ہے۔ تمہارے پاس میری ایک ہی تصویر تو ہے اور لوگ اسے بار بار دیکھ کر تنگ آ چکے ہوں گے لیکن میں اس بارے میں کوئی حکم لگانا نہیں چاہتا۔ مجھے دکھاوے اور نمائش سے کچھ فرنگیانہ قسم کی چڑ ہے لیکن اب ہم اس بارے میں اتنے نک چڑھے نہیں جیسے کہ پہلے تھے۔

کلثوم[1] کے بارے میں جو حال تم نے لکھا ہے بہت پر لطف تھا۔ کچھ اخفا، کچھ شک اور گمان تشہیر کے لئے اچھی چیز ہے اور یہ بھی اچھا ہے کہ ہماری آشنائی کسی کلثوم سے نہیں ہے۔ دُور دُور سے بھی نہیں ورنہ کوئی خاتون دل ہی دل میں ضرور اس کتاب کو اپنا لیتیں اور سمجھتیں کہ ہم پہلی دفعہ کوئی پوشیدہ رازِ عشق ظاہر کر رہے ہیں اور کچھ تعجب نہیں کہ اس انکشاف سے بے چارے کے دل کی کوئی شریان پھٹ جاتی۔

آج ایک اچھا جملہ پڑھا تھا۔ کوئی ماں آسانی سے اپنا بچہ کسی کے حوالے نہیں کرتی اور ہم میں سے ہر کوئی ایک بچہ اپنے دل میں لئے پھرتا ہے۔ یہ بچہ مستقبل ہے۔ صرف اپنا ہی نہیں ساری دنیا کا مستقبل۔

۷۸

۳؍ مارچ ۱۹۵۳ء

اسلامی تاریخ کا نیا تجزیہ لکھنے کی پیشکش بہت دل آویز ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام میں بہت شوق سے کروں گا۔ اگرچہ کچھ کہہ نہیں سکتا کہ میں اس کا اہل بھی ہوں یا نہیں فی الحال میں اس تجویز سے زیادہ اُمید وابستہ کرنا نہیں چاہتا۔ یقین نہیں آتا کہ یہ پوری ہو سکے گی۔ مہربانی کر کے حکیم[2] صاحب سے ٹیلی فون پر کہہ دو کہ اگر اس بارے میں پہلے وہ لکھیں تو مجھے سہولت ہوگی۔ لیکن اگر اس میں تکلف یا حفظِ مراتب کا کوئی پہلو ہو تو مجھے

---

[1] ایلس کا نام شادی کے بعد فیض کی والدہ نے کلثوم رکھا تھا۔ دستِ صبا ایلس کے نام معنون ہے۔ انتساب کے صفحے پر "کلثوم کے نام" لکھا ہے۔

[2] ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم۔

انہیں لکھنے میں عذر نہیں اگر وہ مجھے لکھنے پر رضامند ہوں تو مناسب ہو گا کہ شرائط وغیرہ کے بارے میں بھی کچھ اشارہ کر دیں۔

ہندوستان میں دستِ صبا کے چھپنے کا یہ ہے کہ میں کے ایم احمد کو جانتا ہوں۔ لیکن مجھے کچھ علم نہیں کہ وہ طبع واشاعت کا کوئی کاروبار کر رہے ہیں کہ نہیں اگر ایسا ہے تو وہ رائلٹی کیسے ادا کریں گے اور کب اور کیسے؟ بہتر ہو گا تم یہ معاملات پہلے سے صاف کر لو۔ غالباً سب سے اچھی بات یہی ہے کہ وہ پیشگی رائلٹی چمپا یا پھر جوئل[1] کے پاس جمع کرا دیں۔ چمپا کا ایک اور خط آیا تھا۔ لکھا ہے کہ کے۔ رے (شاید تمہیں یاد ہو پنڈی والے رے جو پنڈی۔ پشاور وغیرہ میں لندن بک شاپ کے مالک تھے۔) بھی یہ کتاب چھاپنا چاہتے ہیں۔ اگر احمد سے معاملہ نہ بنے تو رے کی پیشکش پر بھی غور کر لو۔ شاید تمہیں یقین نہیں آئے گا کہ گزشتہ تین ماہ سے یہاں کا میس اور حساب کتاب سب ہمارے ذمّے ہے۔ ایسا بہترین انتظام کیا ہے کہ جواب نہیں (دیکھا ہم کیسے کاروباری ہوتے جا رہے ہیں۔)

دستِ صبا کے ترجمے کے بارے میں وکٹر[2] کا خط آیا تھا۔ ساری کتاب کا ترجمہ شاید ضروری نہ ہو۔ غالباً بہتر ہو گا کہ دونوں کتابوں سے انتخاب کر لیا جائے اس طرح کام کم ہو جائے گا۔ اور وکٹر نقشِ فریادی کے بہت سے حصّے کا ترجمہ کر بھی چکے ہیں تم لوگ آپس میں طے کر لو اس پر یاد آیا کہ دوسرے ایڈیشن کے کچھ نسخے یہاں بھجوا دو۔ ابھی ہمارے آدھے ساتھیوں کو کتاب نہیں ملی ہے جس پر وہ منمناتے رہتے ہیں۔

تمہارے یہاں آنے کے بارے میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ کچھ دن اور انتظار کر لو تاکہ چھیمی کے امتحانات اور تمہاری مقدمے بازی ختم ہو جائے اور اس ننھی بیوقوف چھیمی سے کہو کہ شہنشاہ شاہجہاں قطعی طور سے اُس کے قابل نہ تھا۔ اس کی بہت بڑی توند تھی، بہت خوفناک داڑھی تھی اور اُسے مٹھائیوں سے بالکل رغبت نہ تھی۔ ہم اس کے لئے یقیناً

---

[1] دلّی کے ایک پبلشر۔

[2] ایلس کی سہیلی اور فیضؔ کے دوست سرجیت سنگھ کی بیوی۔

بہتر پر تلاش کریں گے۔ اگر بچوں کو لاہور قلعے کا حال سمجھانا ہو تو تاریخ لاہور کہیں سے تلاش کر لینا۔ گھر میں ہو گی یا دفتر میں۔ افسوس کہ اس کام کے لئے ہم خود وہاں موجود نہیں ہیں۔ سادہ لوح خواتین کا دل لبھانے کے لئے مغلیہ عمارتوں کے قصے کہانیاں بیان کرنا ہمارا محبوب مشغلہ تھا۔ شاید تمہیں وہ زیلما برنیٹ[1] یاد ہو گی جو اسی بات پر بالکل فنا ہو گئی تھی۔

تم چاہو تو خواتین کے بارے میں اپنی فلسفیانہ بحث پھر سے شروع کریں۔ تم کہتی ہو کہ ہمارے فلسفے میں یہ نقص ہے کہ کج فہم لوگ اسے اپنے مقصد کے لئے مسخ کر لیتے ہیں جس سے بدمزگی اور فساد پیدا ہوتا ہے۔ یہ بالکل ٹھیک ہے اگر یہ لوگ ہر بات میں معقول اور نارمل ہوں تو کج فہمی یا کج روی کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اس لئے انہیں سمجھانے بجھانے یا اُن کی کسی طرح دستگیری کرنے کا بھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اگر یوں نہیں ہے تو کیا انہیں بالکل ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہیئے کہ وہ اگر جہنم میں جاتے ہیں تو جائیں؟ مجھے تم سے اتفاق ہے کہ اپنے ذاتی آرام اور سکونِ قلب کی خاطر یہی بہتر ہے اور بیشتر دانشمند لوگ یہی کرتے ہیں لیکن ایک چھوٹی سی اقلیت ان خدائی فوجدار قسم کے لوگوں کی بھی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ اس صورت حال میں انہیں ضرور مداخلت کرنی چاہیئے۔ اس خیال سے کہ شاید اس طرح کسی کی بہتری ہو جائے۔ یہ خیال عام طور سے غلط ثابت ہوتا ہے۔ تو پھر وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ میں اپنے بارے میں بتا سکتا ہوں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ بہت ہی کم انسان ایسے ہوتے ہیں جو فطری اور بنیادی طور سے بد ہوں (میں افراد کا ذکر کر رہا ہوں اداروں یا جماعتوں کا نہیں) اور بیشتر لوگوں کی فطرت میں مختلف تناسب سے نیکی اور بدی دونوں شامل ہوتی ہیں۔ ابتدائے عمر میں اس امتزاج کی صورت بدلتی رہتی ہے لیکن بعد میں دھیرے دھیرے یہ ایک خاص سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ تب اِسے بدلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن جب بھی اِسے کچھ زیر و زبر ضرور کیا جا سکتا ہے۔ عارضی طور ہی سے سہی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ڈانٹ ڈپٹ کرنے یا کڑکنے گرجنے سے یہ کام نہیں ہو سکتا البتہ محبت اور دوستی

---

[1] ایک امریکی خاتون، صحافی اور سماجی کارکن۔

کچھ موثر ہو سکتی ہے۔ کیا اس دردِ سر سے کچھ حاصل بھی ہوتا ہے؟ عام طور سے نہیں ہوتا لیکن کبھی کبھار، بایدو شاید ہوتا بھی ہے۔ بہر صورت اس کام میں ہاتھ ڈالنے کو ضرور جی چاہتا ہے۔ شاید اپنی نیکی کی وجہ سے نہیں بلکہ خود پسندی کی وجہ سے اور حماقت یہی کہتی ہے کہ شاید تم اس قابل ہو کر کسی کا بھلا کر سکو خواہ جواب میں تمہیں برائی ہی کیوں نہ ملے اور اگر کوئی یہ جتانے کی کوشش کرے کہ یہ محض حماقت ہے تو ضد میں آ کر آدمی اپنی بات پر اور بھی ڈٹ جاتا ہے۔ اور یہ بھی خود پسندی کی ایک صورت ہے غالباً تم سمجھتی ہو گی کہ یہ سب خرافات ہے جو کہ غالباً ہے اس لئے بحث بند۔

تو میری تپ دق کی مریضہ نمودار ہو گئی مجھے اس کے بارے میں بس اتنا معلوم ہے کہ وہ مشرقی پنجاب کی مہاجر ہے۔ اس نے ڈاڈر سینی ٹوریم سے مجھے امداد کے لئے لکھا تھا اور میں نے اُسے حکومتِ سرحد سے کچھ وظیفہ اور قائد اعظم فنڈ سے کچھ پیسہ دلوا دیا تھا اگر وہ صحتیاب ہو جائے تو اس خیال سے بہت خوشی ہو گی کہ ہم نے کسی کی جان بچا لی۔ عام طور سے تو آدمی کسی کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔

تم نے پوچھا ہے کہ میرا دل چین سے ہے کہ نہیں۔ بالکل ہے اور ضرورت سے کچھ زیادہ ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ اپنا ذہن یہاں کے گرد و پیش سے بالکل غافل اور بے خبر ہے کبھی کبھی میں اسے جھنجھوڑ کر جگاتا ہوں تو سوچ میں پڑ جاتا ہوں کہ ہم جیل خانے میں کیا کر رہے ہیں۔ ہم نہ چور ہیں نہ سیاسی لیڈر اور ہمیں یہاں رکھنے میں کس کا بھلا ہو رہا ہے۔ لیکن یہ دنیا عجیب چیز ہے۔ اگلے دن میں نے بیگم چھجو ناگڑھ کی سزا کا[1] بڑھا تو کچھ دلچسپ حساب لگانا شروع کیا۔ انہیں ایک دن کی سزا ہوئی تھی۔ چار سال میں چودہ سو ساٹھ دن ہوتے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم قریباً پندرہ سو بادر کے ایک قاتل ہیں۔ دل دہلا دینے والی بات ہے کہ نہیں؟

---

[1] بانو نام کی ایک کنیز کے قتل میں اعانت کا جرم ثابت ہوا تھا۔

۷۹

۱۱ مارچ ۱۹۵۳ء

میں نے یہ خط پہلے اس لئے نہیں لکھا کہ لاہور کی ڈاک بند[1] تھی۔ میں اس دوران میں تمہارا اور اپنے آفت زدہ شہر کا سوچتا رہا۔ اپنے لوگوں کے مصائب پر دل کڑھتا ہے لیکن شاید اس بارے میں کچھ کہنا یا لکھنا مناسب نہیں۔ تمہارا تار مل گیا ہے اور اب اس بارے میں پریشانی نہیں رہی تم نے لکھا تھا کہ چھیمی کسی کی شادی میں گئی ہے اس وجہ سے ذرا تشویش تھی۔ امید ہے کہ وہ خیریت سے گھر پہنچ گئی ہوگی۔ دکٹر کے بارے میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ غالباً وہ اتنے معروف ہیں کہ دستِ صبا کا پورا ترجمہ نہیں کر سکیں گے اور میرے خیال میں اس کی ضرورت بھی نہیں۔ نقشِ فریادی کے کافی حصّے کا ترجمہ کر چکے ہیں اس لئے دستِ صبا میں سے چند نظمیں شامل کریں تو کافی ہے۔

خطوط کی اشاعت کے بارے میں مجھ سے نہ ہی پوچھو تو اچھا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کتابی صورت میں یہ بالکل احمقانہ معلوم ہوں گے۔ بہتر یہ ہے کہ اس بارے میں کسی غیر جانبدار آدمی سے پوچھو۔ کاش ایسے قصّوں کا فیصلہ کرنے کے لئے اے۔ ایس۔ بی یہاں موجود ہوتے۔ بہرصورت اگر انہیں چھپوانے کا فیصلہ کرو تو یہ اردو میں چھپنے چاہئیں۔ اگر میں بہت احتیاط اور سوچ بچار سے نہ لکھوں تو ہماری انگریزی تحریر بہت آرائشی اور گڈ مڈ معلوم ہوتی ہے۔ تمہارے کتاب کے مقدّمے کا کیا ہوا۔ اخبار میں دیکھا ہے کہ تمہیں عارضی حکم امتناعی مل گیا ہے۔ اگر تمہارے حقوق محفوظ ہو جائیں اور دوسرا فریق کسی معقول تصفیئے کے لئے تیار ہو تو زیادہ قصّہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ ہمارا مشورہ ہے حکم نہیں ہے۔

میں نے دوبارہ لکھنا شروع کر دیا ہے اور شاید اس ہفتے کے آخر تک کچھ اشعار[2] ہو جائیں گے۔ اپنے گرد و پیش جو کچھ ہو رہا ہے اس کے بارے میں کچھ لکھنے کی کوشش کی ہے۔

---

[1] ختم نبوّت کی تحریک کے سلسلے میں لاہور میں مارشل لاء نافذ تھا۔

[2] ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن نہ تھیں تری انجمن سے پہلے۔

۸۰

۱۸ مارچ ۱۹۵۲ء

آخر تمہارا خط ملا۔ اس سے پہلے ملنے کی اُمید بھی نہ تھی۔ اور تمہیں بھی میرے خط کا انتظار رہا ہوگا۔ میں تصور کر سکتا ہوں کہ تم لوگ کیسے مشکل وقت سے گزر رہے ہو۔ ہمارا جیل خانہ تو کسی اور دنیا کا ایک گوشہ معلوم ہوتا ہے۔ جہاں نہ حادثاتِ زمانہ کا گزر ہے اور نہ زندگی کے خطرات کی آزمائش۔ یہاں نہ زندگی کا وجود ہے نہ موت کا اور جیتے جاگتے انسان جو ہنستے ہیں روتے ہیں پیار کرتے ہیں اور لڑتے جھگڑتے ہیں سب کسی گرانڈیل افسانوی کتاب کے کردار معلوم ہوتے ہیں جو ابھی تصنیف بھی نہیں ہوئی۔ یہ محسوس کرنے کے لئے کہ ہم بھی زندہ ہیں اور ہم بھی زندوں کی برادری میں اور ان کے دکھ درد میں شامل ہیں تخیّل پہ کافی زور دینا پڑتا ہے لیکن شاید یہ بھی پوری طرح صحیح نہیں ہے اس لئے کہ جہاں تک جنسیات کا تعلق ہے جیل خانے میں کوئی بھی بات پوری طرح صحیح نہیں ہوتی۔ مطلب یہ ہے کہ ان طویل اور بے رنگ شب و روز میں جہاں اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم زندگی اور موت سے پرے کسی غیر مادی دنیا میں داخل ہو چکے ہیں یکایک ایسے لمحے بھی آتے ہیں جب زندگی سے اپنی یگانگت اور وحدت وجود کا بہت شدت سے احساس ہوتا ہے محبت اور روشنی اور مسکراہٹ کی تلاش بھی لکھوکھا دلوں، ان گنت انسانی جسموں کے درد و شجاعت، عالی ظرفی اور کلفت و آلام سے یک جان ہونے کا احساس اور پھر وہ لمحے آتے ہیں جب غلیظ، زرد دیواروں، دھول اور مٹی، زنجیروں، پہروں، وردیوں اور ان سب لعنتی چیزوں پر نظر پڑتی ہے جسے جیل خانہ کہتے ہیں تو یکایک کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ موج در موج کراہت اور بیزاری کا سیلاب اندر سے اٹھتا ہے جس میں اپنی ذات اور باقی ہر چیز غرق ہو جاتی ہے پھر ایسے لمحے بھی آتے ہیں کہ کوئی ننھا سا بیج سیاہ بوجھل مٹی کو بہت سلیقے سے ہٹا کر ایک ننھی سی کونپل زمین سے برآمد کرتا ہے اور اسے دیکھ کر دل بے پناہ اور ناقابلِ بیان مسرّت سے لبریز ہو جاتا ہے۔ اور تمام وقت دل جانتا ہے کہ اسی سبز کونپل کے ننھّے ہاتھوں میں حقیقت بھی ہے اور ابدیت بھی جیل کی دیواریں اور پہریدار اور وردیاں سب جھوٹ

ہیں، سب غیر حقیقی ہیں۔ اسی صورت سے دل یہ بھی جانتا ہے کہ ہم میں سے ہر ایک لحد میں سو جانے کے بعد بھی جینے والوں کی ملکیت اور ان کے رنج و راحت میں دخیل رہتا ہے۔ جیل میں محرومیاں بہت ہیں لیکن جینے اور ہنسنے اور پیار کرنے کے اسباب میں یہاں بھی کمی نہیں ہوتی۔ محرومیوں کا ذکر آیا تو کل شام کا ایک قصہ سنو۔ میں اور پوشنی[1] کراچی ریڈیو سے امریکی Pop موسیقی سن رہے تھے۔ ایک ریکارڈ کے شروع ہونے سے پہلے اناؤنسر نے اپنے مخصوص امریکی لہجے میں کہا "تو لوگو تیار! Here we go اپنے اپنے پارٹنر کو دبوچ لو اور ناچ شروع۔" پوشنی نے فی الفور ایک فلک شگاف نعرہ بلند کیا "دبوچ لوں تمہاری سوّر کی سی گردن؛ پارٹنر کا بچہ ...... فلاں کی اولاد" وغیرہ وغیرہ۔

اب پھر سے تجویز سنی گئی ہے کہ مقدمے کا فیصلہ وکلاء کو دکھایا جائے۔ میرے خیال میں اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا لیکن اگر منظور قادر کو اطلاع نہیں ملی ہے تو بتلا دینا۔

یہ ہمارا یار چارلی[2] کہاں سے آنکلا اس کے ذکر سے دل بہت خوش ہوا۔ اسکا تو نام سنتے ہی ہنسی چھوٹنے لگتی ہے۔ اس کی مسکراتی ہوئی بتیسی کے بغیر اس کا چہرہ تصوّر ہی میں نہیں آتا۔ اس نے شادی کر لی ہے کہ نہیں؟ اگر کر لی ہے تو اس سے کہنا کہ مجھے شدید اصرار ہے کہ اپنی بیوی کی تصویر ہمیں بھیجے۔ جس لڑکی نے اسے اپنا میاں چنا ہے اسے ضرور وکٹوریہ کراس ملنا چاہیئے۔ تم نے پوچھا تھا کہ ایک نیا لباس خریدنے کے بعد تمہیں کچھ گناہ کا احساس کیوں ہو رہا ہے میں نہیں سمجھتا کہ اس کا فرائڈ کے نظریئے سے کوئی تعلق ہے۔ میری رائے میں یہ احساس اس وجہ سے ہوتا ہے کہ کہیں دیکھنے والے یہ نہ سمجھیں کہ ہم ایّام غم میں سوگ منانے

---

[1] جیل کے ساتھی ظفر اللہ پوشنی۔

[2] رمیش چندر عرف چارلی۔ لاہور میں تانگے والوں کے لیڈر اور اب ہندوستان کی ٹیلیویژن سروس میں ملازم۔

کے بجائے خوشی منا رہے ہیں۔ اور ہمیں بے حس یا سنگدل نہ تصور کریں لیکن یوں سوچنا بالکل احمقانہ بات ہے اس لئے کہ غم اور تکلیف ہی کا زمانہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب خوش دلی اور بشاشت سب سے زیادہ درکار ہوتی ہے اور دل کی ڈھارس باندھنے کے لئے ظاہری شکل و صورت کے بناؤ سنگھار سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ جیل میں ہم جو فیشن پریڈ کرتے رہتے ہیں اس کا راز یہی ہے۔ جسمانی راحت کے علاوہ اس سے حوصلہ بھی بلند رہتا ہے۔ جہاں تک رائے عامہ کا تعلق ہے شاید میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ روحانی آسائش کے لئے نہ صرف اسے کبھی کبھی نظر انداز کر دینا چاہیئے بلکہ اس پر کھلم کھلا لعنت بھیجنی چاہیئے۔

۸۱

۲۴ مارچ ۱۹۵۲ء

یہ سوچنا بالکل بے وقوفی کی بات ہے کہ تم یہاں خالی ہاتھ آؤ گی۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ اپنی رفاقت سے زیادہ بیش قیمت کوئی تحفہ تم ساتھ نہیں لا سکتیں۔

لیکن تم آؤ تو کچھ فرانسیسی کتابیں، دستِ صبا کے کچھ نسخے، فارسی لغت اور عروض کی کتابیں جن کا ذکر پہلے کر چکا ہوں (دستیاب ہو سکیں تو) ساتھ لے آنا۔ پنجابی کی ہیر رانجھا جو میں نے لوٹا دی تھی وہ بھی واپس چاہیئے۔ باسویل کی لائف آف جانسن، لوٹن بی کی اسٹڈی آف ہسٹری اور شیکسپئر کا پینگوئن ایڈیشن بھی مجھے درکار ہے۔ ان میں سے اگر کوئی کتاب نہ لا سکو تو کچھ مضائقہ نہیں میرے پاس پڑھنے کو کافی کچھ موجود ہے اور فی الحال ان سے کام چلا سکتا ہوں۔

نقشِ فریادی کے مقدمے کے بارے میں تم اور تمہارے وکیل بہتر جانتے ہیں۔ ہر پابند قانون شہری کی طرح مجھے فطری طور سے ساری عدالتوں سے ہول آتا ہے اور ان ہی کی طرح یہ فطری خواہش رہتی ہے کہ جو قصہ عدالت سے باہر جتنی جلد نپٹ سکے اچھا ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ رجحان کچھ احمقانہ ہے۔ بددیانت لوگ اسی پر تکیہ کر کے جان بچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ تمہارے آنے پر یہاں موسم بہت اچھا نہیں ہوگا لیکن کچھ ایسا ناخوشگوار بھی نہیں۔ بہرصورت لوگوں کی زندگی ایسی ناخوشگوار

ہوتی جارہی ہے کہ موسم سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ سوچ کر دُکھ ہوتا ہے کہ تم اور تم جیسے لاکھوں کے لئے روزمرّہ زندگی کی اس رسّی پر قدم جمائے رکھنا کتنا مشکل ہوگا جو دن بدن باریک اور زیادہ طویل ہوتی جارہی ہے لیکن اپنا توازن قائم رکھنا تو اس لئے لازمی ہے کہ اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ کبھی کسی دن اس رسّی سے اتر کر ہم بھی کسی سبزہ زار پر آرام کریں گے اور پھولوں کو کھلتے ہوئے اور بچّوں کو گاتے ہوئے دیکھیں گے۔ محنت اور سختی اور دُکھ تو جب بھی ہوگا لیکن اس کے مقابل محبّت اور زندگی کی آسودگی اور بارآوری بھی ہوگی۔

۸۲

۳۰ مارچ ۱۹۵۳ء

کل بہت شاندار دن گزرا۔ پہلے ہمارے دو ساتھی صادق[۱] اور ضیاء[۲] دوسرے گھر (وارڈ) میں منتقل ہوگئے تھے۔ اس کے بعد سے ضیاء جو کہ ہماری کمپنی کے مزاحیہ اداکار ہیں اپنے وارڈ میں ایک پائیں باغ تیار کر رہے ہیں جس میں ہتھیلی کے سائز کی روشیں اور نسوانی انگلیوں کے سائز کی آب جوئیں ہیں۔ پرسوں رات ہمیں ایک بہت ہی پرتکلف دعوت نامہ ملا جس پر بہت سے نقش و نگار کے علاوہ یہ تحریر تھی۔

"اے کلاس کی جانب سے بی کلاس والوں سے

درخواست

کی جاتی ہے کہ فلاں دن بمقام اے کلاس

برلبِ آبِ رواں ناشتہ تناول فرمانے کی

زحمت گوارا فرمائیں۔

نوٹ

ازراہِ مہربانی اپنا ناشتہ ساتھ لائیں۔"

چنانچہ کل صبح ہم باقاعدہ تیار ہوکر آبِ رواں پارٹی پر گئے۔ شالامار میں شاہ

---

[۱] بریگیڈیئر صادق خاں [۲] کرنل ضیاء الدین۔

ایران کی پارٹی اس کے مقابلے میں ہیچ ہے۔ پلنگ اس طرح بچھائے گئے کہ صوفے نظر آئیں سایہ دار گوشوں میں آرام کرسیاں بچھائی گئیں۔ بام کے بالشت بھر درخت کے نیچے ریڈیو سیٹ چھپا کر رکھا گیا تھا پانی کے واحد نل کے نیچے ایک منّا سا حوض بنایا گیا جہاں سے پانی ننھی ننھی نہروں آبشاروں اور فوّاروں کی صورت میں رواں تھا۔ ہم نے تمام دن کھلی فضا میں درختوں کے نیچے گزارا۔ برج کھیلتے رہے، گپ کرتے رہے، آسمان کو تکتے رہے۔ جیل کی دیواریں نظر سے دور بہت دور کہیں غائب ہوگئی تھیں۔

شام کو ہمارے وارڈ کی بجلی فیل ہوگئی۔ دیر کافی ہو چکی تھی اور جیل کے مستری رخصت ہو چکے تھے مجھے بجلی سے ہمیشہ ڈر لگتا ہے۔ اوّل اس وجہ سے کہ بجلی کے دو ایک حادثے نظر سے گزر چکے ہیں۔ دوسرے یہ کہ بجلی کے مزدوروں کے لئے میں نے بہت سی ایسی درخواستیں لکھی ہیں جن میں دستانے اور دوسرا حفاظتی سامان مہیّا نہ کئے جانے کی وجہ سے مزدوروں کے مجروح اور ہلاک ہونے کی شکایتیں کی تھیں۔ اسی سبب سے جب کبھی یہاں مستری وغیرہ بجلی ٹھیک کرنے کے لئے آتے ہیں تو میں ہمیشہ دیکھ لیتا ہوں کہ ان کے پاس یہ سامان ہے کہ نہیں۔ یہ لوگ عام طور سے دن میں آتے ہیں اور سیڑھیاں اور بہت سا اَلّم غلّم ساتھ لاتے ہیں چنانچہ جب کل شام بجلی فیل ہوئی تو ہم سمجھتے رہے کہ یہ لوگ اپنا ساز وسامان لے کے آئیں گے کیونکہ نقص بجلی کے کھمبے کے تاروں میں تھا۔ کافی انتظار کے بعد ایک منحنی سا شخص کاندھے پر ایک تھیلا اٹھائے ہوئے نمودار ہوا۔ ہم نے کہا میاں کوئی سیڑھی ویڑھی لے کے آؤ نقص تو کھمبے کے تاروں میں ہے۔ مگر اس شخص نے سُنی اَن سُنی کر دی۔ دیکھتے کیا ہیں کہ پل بھر میں وہ کھمبے کی چوٹی پر جا پہنچ گیا۔ ہم سب نے پریشان ہو کر آوازیں دینی شروع کر دیں کہ دیکھو احتیاط کرو بجلی کے تار ہیں۔ مین سوئچ بند کرواؤ، دستانے منگواؤ وغیرہ وغیرہ۔ وہ شخص کچھ منمنایا جس سے غالباً مُراد یہ تھی کہ آپ لوگ بکواس بند کریں۔ پل بھر میں یہ حضرت کھمبے سے اُتر چکے تھے اور بجلی جل چکی تھی۔ بالکل کسی سرکس کا کرتب معلوم ہوتا تھا۔ ہمارے عوام میں کتنی صلاحیت ہے اور کتنا جوہر ہے جو کسی کام ہی میں نہیں آتا۔ اور جو محض تلخی، افلاس اور بھوک کی نذر ہو جاتا ہے۔

۸۳

۲۱ / اپریل ۱۹۵۳ء

گزشتہ دن خط و کتابت میں گڑبڑ ہو گئی جس کا افسوس ہے۔ اس کا سب سے بڑا سبب تو موسم ہے۔ اس موسم میں اُس اسفل مخلوق پر رشک آتا ہے جو خراب موسموں میں لمبی تان کر دنیا و مافیہا سے غافل ہو جاتی ہے۔ اور جب موسم بدلتا ہے تو پھر بیدار ہوتی ہے افسوس کہ فطرت نے انسانوں کو یہ استعداد نہ دی کہ وہ بھی اسی طرح چند ماہ کے لئے کہیں زیرِ زمین بے سُدھ پڑے رہتے اور پھر تازہ دم ہو کر باہر نکل آتے۔ ویسے اس جگہ یوں بھی بہت سا وقت نیم مدہوشی ہی کے عالم میں گزرتا ہے اور سوچنے یا محسوس کرنے کی ذرا سی کوشش سے پسینہ آنے لگتا ہے۔ جیل خانے میں اس کیفیت کے لئے آدمی کچھ احسان مند محسوس کرتا ہے جب وقت زیادہ تیز رفتاری سے گزرتا ہے اور دردِ دل کا احساس نہیں رہتا۔

کل عید کا دن تھا۔ اس بار یہ دن بہت خاموشی اور تنہائی میں گزرا اس لئے کہ اسحاق[1] کے بھائی کے علاوہ کسی کے عزیز و اقارب ملاقات کو نہیں آئے تھے۔ صبح جب میں کپڑے بدل رہا تھا تو بہت سی پُرانی یادیں اور بہت سے بھولے بسرے خیال اپنی اپنی کمین گاہوں سے نکلے اور میں نے دیکھا کہ عیدگاہ میں گھنے پیڑوں کے تلے میرے ابّا[2] خطبہ دے رہے ہیں (عید کی نماز سے پہلے ہمیشہ وہ خطبہ دیا کرتے تھے) اور میں نے دیکھا کہ اگلی صف میں میں اور طفیل مخمل کے کوٹ پہنے بیٹھے ہیں اور پھر نماز کے بعد ہماری فٹن عیدگاہ سے چلی ہے۔ گھوڑوں کی گردن میں بندھی ہوئی گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ سائیس سڑک کی دونوں جانب پیسے پھینک رہا ہے اور شور مچاتے ہوئے بچے گھر تک ہماری گاڑی کے ساتھ دوڑے جا رہے ہیں۔ پھر وہ گھڑی یاد آئی کہ ہم زنان خانے کے صحن میں داخل ہوئے ہیں جو بہت سی عورتوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ میری سگی بہنیں ہیں۔ ان کے بچے ہیں، خادمائیں ہیں، گاؤں کی غریب مہمان عورتیں ہیں۔

---

[1] جیل کے ساتھی سابق میجر محمد اسحاق جنہوں نے زندان نامے کا دیباچہ بھی لکھا ہے۔

[2] فیض کے والد کا نام سلطان احمد خاں تھا۔

ہمارے ابّا کے داخل ہوتے ہی یکایک صحن میں سنّاٹا چھا جاتا ہے باری باری سب ان کا ہاتھ چومتے ہیں۔ پھر ہماری دادی راستہ ٹٹولتی ہوئی اپنے کمرے میں سے نکلتی ہیں اور ہمارے ابّا ماں کی دعا کے لئے اپنا بارُعب سَر ان کے آگے جھکا دیتے ہیں اور وہ ان کے سر پر ہاتھ پھیرتی اور دعائیں دیتی ہیں۔ پھر ابّا باہر مردانے میں چلے جاتے ہیں۔ سکوت ٹوٹ جاتا ہے اور صحن میں سب لوگ ہنسی مذاق اور شور و غل سے آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں سب محبتیں، سارے غم، سب خوشیاں یاد آئیں اور دل نے چاہا کہ ان سب کو گلے لگا کر آہ و زاری کرے لیکن آہ و زاری شروع ہونے سے پہلے میں نے ان سب کو رخصت کر دیا۔ دوپہر میں ایک ضیافت ہوئی اور ہم ہنسی مذاق اور گپ شپ کرتے رہے لیکن وقت مشکل سے گزرا اور سورج غروب ہوا تو تسکین محسوس ہوئی۔

اس کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا کہ میری خرابیٔ صحت کی وجہ سے ہم یہ جنگ ہار جائیں اس بارے میں میرا ارادہ بالکل پختہ ہے اگر کوئی بات ہوتی تو میں ضرور تمہیں لکھ دیتا۔ صرف اتنا ہے کہ کان میں تکلیف کی وجہ سے میں نے کچھ دن کھیلوں میں حصّہ لینا چھوڑ دیا تھا لیکن یہ بہت دن پہلے کی بات ہے اور اب میں نے دوبارہ ورزش شروع کر دی ہے اب کان میں درد تو نہیں ہے لیکن کچھ Infection ابھی باقی ہے اسلئے بہت سی بور دوائیں کھانی پڑتی ہیں۔ جب تک ہم کسی زیادہ مہذّب جگہ نہ جائیں میرے دانتوں کا تو کچھ ہو نہیں سکتا۔ کبھی نہ کبھی اس کی نوبت بھی آجائے گی۔ اگرچہ کہہ نہیں سکتے کہ کب۔

بچّوں کی تصویریں جو تم نے بھیجی ہیں بہت خوبصورت ہیں۔ آج میں نے بہت سے خوشگوار لمحے اس تصور میں گزارے کہ جب یہ بڑی ہوں گی تو کیسی نظر آئیں گی۔ آنے والے برسوں میں ان کی دنیا کیسی ہوگی اور اس دنیا میں ان کی کیسے بسر ہوگی۔ اُمید ہے کہ ان کی دنیا اس دنیا سے بہتر اور کم دردانگیز ہوگی جس میں ہم رہتے ہیں۔ اُمید ہے کہ انہیں عید کارڈ پسند آیا ہوگا۔

۸۴

۲۶ / اپریل ۱۹۵۳ء

مجھے خوشی ہے کہ اس بار دوستوں کی مہربانی سے تمہارا قیام زیادہ آرام دہ تھا آخر کار بچوں نے کراچی کی سیر بھی کرلی۔ امید ہے کہ تم نے بھی یہی محسوس کیا ہوگا۔ میری صحت کے بارے میں کسی تشویش کی ضرورت نہیں اس لئے کسی قسم کے پریشان کن خیالات کو اپنی مسرت میں حائل ہونے نہ دو۔ میرا کارڈیو گرام لیا جاچکا ہے اور کل ایکس رے ہوگا۔ ایک دندان ساز قسم کے کوئی صاحب آئے تھے۔ بہت سی دوائیاں دے گئے ہیں۔ میں نے درخواست دی ہے کہ مجھے چند دنوں کے لئے کراچی بھیج دیا جائے تاکہ کوئی ماہر ڈاکٹر معائنہ کرسکے۔ نہ جانے یہ درخواست منظور ہوگی کہ نہیں، لیکن تم خاطر جمع رکھو۔ ڈاکٹر سیلرز کی دوائیوں کی فہرست مجھے مل گئی ہے اور آج کل میں انہیں شروع کردوں گا۔ کارڈیو گرام اور ایکس رے کے نتائج آئیں گے تو بھجوا دوں گا وہ انہیں دکھا دینا اور ان کی تشخیص اور مشورہ یہاں بھجوا دینا۔ تمہارے یہاں آنے سے پہلے حکومت کے اعلیٰ ایوانوں میں کچھ عجیب تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ عجب لطیفہ ہے کہ ہمارے ہاں اہم سیاسی واقعات غور و فکر کا سامان بہم پہنچانے کے بجائے صرف کامیڈی کا تاثر پیدا کرتے ہیں اس سے خیال آیا کہ تم لوگوں نے اپنی اخبار نویسی کے بارے میں عجیب وطیرہ اختیار کر رکھا ہے۔ امروز میں پانچ دن کے بعد اس واقعہ پر تبصرہ ہوتا ہے۔ اور پاکستان ٹائمز میں تو کوئی ذکر ہی نہیں۔ کیا وہاں کوئی صاحب الہام کے انتظار میں بیٹھے ہیں یا اداریہ نویسوں نے ہڑتال کر رکھی ہے۔ خیر مجھے اس سے کیا غرض۔ ہم تو اب صحافی نہیں رہے۔

حکیم صاحب[1] کو کہلوادو کہ اسلامی تاریخ کے بارے میں ایک دو دن میں انہیں تفصیلی خط لکھوں گا۔

۸۵

۲۹ / اپریل ۱۹۵۳ء

اس جگہ گرمیوں کا یہ تیسرا موسم جارہا ہے اور یوں محسوس ہونے لگا ہے کہ

---

[1] ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم۔

ہم ہمیشہ سے یہیں کے باسی ہیں ۔ ایسے لگتا ہے کہ یہ تین موسم تیس برس کے برابر ہیں اور ان دلوں کے بعد جب ہم نے آخری بار اپنے چہرے پر برسات کی بوندوں کا لمس اور اپنی آنکھوں میں سبزہ و مرغزار کی ٹھنڈک محسوس کی تھی ۔ اب تک آدھی عمر بسر ہو چکی لیکن ان دنوں کی یاد اتنی دھندلی ہو گئی ہے کہ اس سے دل زیادہ نہیں دکھتا اور اب امید نے نت نئے سراب دکھا کر دل کو ستانا چھوڑ دیا ہے اس لئے اب ہم راضی بہ رضا ہیں ۔ اور انتظار اور آرزو سے اپنا دل نہیں جلاتے (یعنی ایک حد تک)

میری صحت کے بارے میں تشویش نہ کرو ۔ میں اچھی طرح اپنا خیال رکھتا ہوں کارڈیوگرام اور ایکس رے دونوں ٹھیک ہیں ۔ صرف کان میں ابھی تک تکلیف ہے جس کا علاج ہو رہا ہے ۔ بڑے صاحبوں سے زیادہ درخواستیں کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا ۔ لیکن اپنے دوستوں سے مشورہ کر لو ۔ اگر وہ سمجھیں کہ اس میں کوئی فائدہ ہے تو درخواست بھجوا دو ۔

جہاں تک گورنر جنرل کو اپیل بھیجنے کا سوال ہے میں صرف چند الفاظ لکھنا چاہتا ہوں اور قانونی دلائل میں نہیں جانا چاہتا جن سے ویسے بھی مجھے کچھ واقفیت نہیں ۔ قانونی کارروائی کے بارے میں حکام کچھ فیصلہ کر نہیں پاتے اور ہمیں کچھ علم نہیں کہ ہمارے وکلاء کیا کر رہے ۔ اس لئے اگر اس بارے میں چند دنوں تک کوئی اطلاع نہیں آئی تو جو بھی سمجھ میں آئے گا ہم خود لکھ کر بھیج دیں گے ۔

جیسے تم نے کہا ہے اس بات سے بہت ڈھارس ہوتی ہے کہ نیکی اور دوستی کا وجود فنا نہیں ہوا اور دنیا سب ظلم و ستم کے باوجود دراصل مشفق اور مہربان ہے کیونکہ اس کی اکثریت ہمارے تمہارے جیسے حقیر غم زدہ لوگوں پر مشتمل ہے جو بدی سے نفرت کرتے ہیں اور جو تھوڑا بہت ان کے پاس ہو اسے اپنے سے زیادہ کم نصیبوں کو راحت پہنچانے کے لئے قربان کر دینے سے دریغ نہیں کرتے ۔ مثلاً اگلے ہی دن کوئی بچی بہت بڑھیا مٹھائیوں کا ایک بڑا سا بکس میرے لئے چھوڑ گئی ۔ دریافت کرنے پر صرف اتنا معلوم ہوا کہ کوئی مس صاحبہ چھوڑ گئی ہیں اس لئے میں یہ بھی نہیں جانتا کہ کس کا شکریہ ادا کروں ۔ شاید تمہاری نئی سہیلیوں میں سے کوئی ہو ۔ بہر حال یہ خیال جیسے بھی

آیا شیرینی سے زیادہ شیریں تھا۔

میں نے حال ہی میں ابسن کے ڈرامے اور اوکیسی کا ڈرامہ The star turns red پڑھا اور بہت لطف اندوز ہوا۔ اس سے احساس ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں تھیٹر کا نہ ہونا کیسی بڑی محرومی ہے۔ شاعری کی واپسی کا کوئی پتہ نہیں چلتا اس لئے بہت جی چاہ رہا ہے کہ کوئی ڈرامہ لکھ ڈالوں۔ اگر جیسے میں چاہتا ہوں ویسا لکھا گیا تو رفیع پیر کے اپنے الفاظ میں "ضرور کرسی سے اُچھل پڑیں گے"۔ افسوس ہے کہ ہم یوم اقبال کا پروگرام سُن نہ سکے، لیکن ہمارا ریڈیو ایسا دَرِ دسر ہے کہ ہم خبروں کے سوا اور کچھ سنتے ہی نہیں۔

۸۶

۱۲ رمئی ۱۹۵۳ء

گزشتہ تین دن میں حسب الحکم اپنی اپیل تیار کرتا رہا۔ یہ ٹائپ ہو رہی ہے اور آج بھجوا دی جائے گی۔ ذہن سے یہ بوجھ اُترا ہے تو شاید اب لکھنا دوبارہ شروع کر سکوں گا اس وقت ذہن بالکل خالی خالی سا محسوس ہوتا ہے لیکن کام شروع ہو گا تو معمول پر آجائے گا۔ آج کل میں ہیولاک ایلس کے مقالات پڑھ رہا ہوں۔ بہت تاسف ہے کہ یہ بیس سال پہلے کیوں نہیں پڑھے۔ عجیب بات ہے کہ گورکی اور رومیں رولاں کے علاوہ اپنے ہم عصر لکھنے والوں میں سے جن کا میں نے مطالعہ کیا ہے بہت کم ایسے ہوں گے جنہیں پڑھ کر ایسی گہری دانائی اور پاک باطنی کا احساس ہو۔ ہیولاک ایلس کا بنیادی موضوع ظاہر ہے کہ جنسیات ہے لیکن وہ اس موضوع پر اس تحریم اور حُسنِ نظر سے بحث کرتا ہے کہ اس بارے میں اپنے اجڈ اور جاہلانہ خیالات پر ندامت ہونے لگتی ہے لیکن ان خیالات کی صرف یہی خوبی نہیں ہے۔ بنیادی خوبی یہ ہے کہ ہیولاک ایلس کو اس موضوع پر جو بصیرت حاصل ہے اُسی کی روشنی میں اس نے زندگی کے دیگر معاملات کا محاکمہ کیا ہے اور اس سے جو نظریۂ حیات مرتب ہوتا ہے وہ بہت پاکیزہ بھی ہے اور دلکش بھی۔ فرائڈ کے بالکل برعکس جس نے اسی صورت اپنے جنسی نظریات کو عالمگیر حقائق کے رنگ میں پیش کیا لیکن نتیجے میں ہر شے تاریک اور گناہ آلود نظر آنے لگی۔

اخباری زبان میں اب یہاں سے مزید صحت نامے جاری نہیں کئے جائیں گے اس لئے کہ کوئی نئی خبر قابلِ تحریر نہیں ہے صرف اتنا ہے کہ مقامی ڈاکٹروں نے دانتوں اور دوسرے امراض کے ماہرین کی خدمات کے لئے کہہ جی لکھا ہے اور اس سفارش کے جواب کا انتظار ہے ویسے میں صحت مند اور خوش و خرم ہوں اور اب بائیں کان سے سنائی دینے لگا ہے۔

کتاب کے مقدمے کی کوئی مزید اطلاع نہیں آئی۔ اس کا گزشتہ مہینے فیصلہ ہونا تھا اب کیا صورت ہے؟

لاہور میں گرمی اور گھٹن سے جو کیفیت ہوگی اس کا میں تصور کر سکتا ہوں اور اس وجہ سے تمہارے اور بچوں کے دن کیسی سختی میں گزر رہے ہوں گے۔ تمہیں سہارا دینے کے لئے میں تو صرف یاد اور محبت ہی کی بخشش کر سکتا ہوں جو ہمیشہ تمہارے ساتھ ہے ہم موسم کے بارے میں اب تک خوش قسمت ہیں۔ صبح و شام بہت تیز اور ٹھنڈی ہوا چلتی ہے۔ جب یہ ہوا ہمارے گنے چنے پیڑوں اور بیل بوٹوں میں سے سنسناتی ہوئی گزرتی ہے تو سب پودے اس کی لے پر رقص کرنے لگتے ہیں اور اس رنگ و آہنگ سے نظر کو عجیب عجیب دھوکے ہوتے ہیں۔ کبھی بچپن کی یاد میں بسے ہوئے کسی پنجابی گاؤں کا دھوکا ہوتا ہے جہاں دور کہیں گائیں بھینسیں ڈکر رہی ہیں اور کسی آنکھ سے اوجھل رہٹ کا پانی جلترنگ بجا رہا ہے اور بڑے بوڑھے گاؤں کے سایہ دار دائرے[1] میں حقے گڑگڑا رہے ہیں۔ کبھی شملے اور کشمیر کے دامن کوہسار کا دھوکا ہوتا ہے۔ چیڑ کے پتوں پر ہلکی ہلکی پھوار گر رہی ہے اور دور بہکتی ہوئی ندیوں کے نغمات کے لئے بادام اور بید مجنوں کے پیڑ گوش بر آواز ہیں۔ کبھی یہ کسی سمندر کا وسیع اور سرسبز ساحل نظر آتا ہے جہاں تیز ہوائیں چلتی ہیں اور دیو ہیکل موجوں کی جھنگھاڑ سنائی دیتی ہے۔ جیل کے گوشے میں بیٹھے ہوئے نظر کے سامنے یہ منظر ابھرتے ہیں ہوا میں لہراتے ہیں اور بکھر جاتے ہیں اور ان لمبے وقفوں میں نہ جیل خانہ

---

[1] پنجاب کے گاؤں میں چوپال کو دائرہ کہتے ہیں۔

باقی رہتا ہے نہ جیل کی دیواروں کا وجود۔

۸۷

۱۹ مئی ۱۹۵۳ء

تمہارے خط سے بہت سی دلچسپ خبریں معلوم ہوئیں۔ پھر آمنہ آئیں اور ہم نے اتوار کا تمام دن ساتھ گزارا اور دنیا بھر کی باتیں کیں اور بیگم امین الدّین کا بہت مشفقانہ خط لائی تھیں جسے پڑھ کر ہم کچھ ہکا بکا سے رہ گئے۔ اب مجھے اس بات پر کچھ کچھ افسوس ہونے لگا ہے کہ میں نے کچھ مردم بیزار زندگی گزاری ہے اور ان لوگوں میں جن سے ہم نے میل جول بڑھانے کی کوشش نہیں کی۔ بہت سے ایسے ہوں گے جو آشنائی کے قابل تھے۔ اس میں کچھ ہماری کاہلی کا دخل ہے اور کچھ ہمارے نک چڑھے پن کو۔ یعنی ناک اتنی اونچی رکھ کر چلنا کہ نیچے کی مخلوق نظر ہی نہ آئے۔ خیر اُمید ہے کہ رفتہ رفتہ ہم زیادہ معقول انسان بن جائیں گے پہلے طبّی رپورٹ سُن لو۔

کان ابھی تک ٹھیک نہیں ہوا اور علاج ہو رہا ہے۔ خون کے دباؤ کی کمی اور اینیمیا کی معمولی سی شکایت ہے۔ یہاں کی تجویز کردہ دواؤں کے علاوہ ڈاکٹر سیلزر کا نسخہ بھی استعمال کر رہا ہوں۔ وٹامن سی، بی، کیلشیم وغیرہ وغیرہ۔ کراچی میں کسی ماہر سے معائنے کی درخواست ابھی تک سُرخ فیتے میں اُلجھی ہوئی ہے۔ کبھی نہ کبھی کچھ ہو جائے گا۔ اس دوران میں یہاں باقاعدہ علاج ہو رہا ہے۔ پرسشِ احوال کے لئے حمید نظامی کا شکریہ ادا کر دینا اگرچہ مجھے یہ توقع نہیں کہ بندوں سے جو یہ دنیاوی خداوند وعدے کرتے ہیں وہ انہیں یاد رہیں یا پورے ہوں۔ لیکن اس سے ایسا کچھ فرق نہیں پڑتا اس لئے کہ ابھی تک میں اپنی اچھی طرح دیکھ بھال کرنے کے قابل ہوں اور تشویش کی کوئی وجہ نہیں۔

یہ سُن کر کہ اپنی دونوں بچیاں گورنمنٹ کالج کے ڈرامے میں پارٹ کر رہی ہیں۔ عجیب کیفیت ہوئی ذہنی یا روحانی طور پر ہم بھی کہیں داد دینے کو موجود ہوں گے۔ تم نے یہ نہیں لکھا کہ کھیل کب ہوگا۔ اگر ہو نہیں چکا تو کچھ تصویریں اتروا کے بھیجو تاکہ ہم دیکھ سکیں اور لوگ بھی دیکھنا چاہیں گے۔

تم نے کہا ہے کہ ہم قید کے باقی ایام کا اندازہ کر کے رہائی کی کوئی تاریخ متعین کریں۔ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ یہ بالکل غلط پالیسی ہے۔ سفر کی منزل کا کبھی نہیں سوچنا چاہئے اس لئے کہ وہ ہمیشہ دور نظر آئے گی۔ صرف اگلے دن اور اگلے قدم کا سوچنا چاہئے اور اس کے بعد جو کچھ ہے اُسے نظر انداز کر دینا چاہئے۔ بہر حال اگر تمہیں اصرار ہے تو حساب لگا سکتے ہیں۔ پانچ جنوری سے میعاد شروع کر کے معمول کے مطابق ایک تہائی مدّت منہا کر دیں تو بقیہ میعاد دو سال آٹھ ماہ بنتی ہے۔ اگر اس میں سے ایک مہینہ سلطانی معافی کا اور جو چار ماہ اب تک گزر چکے ہیں اس طرح پانچ ماہ اور کم کر دو تو دو سال اور تین ماہ بنتے ہیں اس طرح ۵ / اگست ۱۹۵۵ء کی تاریخ متعین کر سکتے ہیں۔ یہ زیادہ سے زیادہ میعاد ہے اسلئے کہ وزراء اور دوسرے اعلیٰ افسروں کے آنے پر جو معافی ملتی ہے وہ میں نے شامل نہیں کی ہے اور میں نے یہ بھی فرض کر لیا ہے کہ اوپر والے حکم عقوبت کی پوری تکمیل چاہیں گے۔ اگرچہ مجھے امید ہے کہ شاید وہ ایسا نہ کریں۔

تم نے بلند کرداری اور کم ظرفی کا ذکر کیا ہے۔ بلند کرداری یا انسانی عظمت کا منبع کوئی کوشش یا جدوجہد نہیں ہوتی بلکہ وہ افراد ہوتے ہیں جو اس میں حصّہ لیتے ہیں۔ جس طور سے وہ اس کا سامنا کرتے ہیں اور جو نیکی اور ایمان وہ اپنے اعمال میں برتتے ہیں۔ درد یا مصیبت یا جدوجہد یا کشاکش میں بجائے خود کوئی عظمت یا نجابت نہیں ہے۔ اس میں عظمت اور بلندی کا عنصر اس ہمت یقین، نیکی اور انسان دوستی سے پیدا ہوتا ہے جس کا جدوجہد میں مظاہرہ کیا جائے اور اگر تلخی یا خود غرضی یا کم ظرفی یا ڈر اور خوف کی وجہ سے جدوجہد کرنے والے یہ عنصر میسّر نہ کر سکیں تو درد کریہہ چیز ہے اور جدوجہد محض مذلیل ہے۔ لازمی بات صرف یہ ہے کہ اپنی ہمت محبت اور نیکی میں فرق نہ آنے پائے اور انسان تلخی، کمینگی اور کم حوصلگی کا شکار نہ ہو جائے باقی سب غیر اہم ہیں۔

یہاں کی خبریں صرف یہ ہیں کہ ایک بیڈمنٹن ٹورنامنٹ کا اہتمام ہو رہا ہے۔ ہماری بلّی کا خاندان اب تیسری پشت تک پہنچ چکا ہے۔ اور ایک بلّی کی بچّی نے بچّے دیئے ہیں اور ہم نے بوگن دل کی دو بیلیں لگائی ہیں جن کے پھول اتنے نازک ہیں کہ مصنوعی معلوم ہوتے ہیں۔

۸۸

۱۹ مئی ۱۹۵۲ء

یہ صرف کاروباری رقعہ ہے۔ میرے گزشتہ خط کے بعد نسیم نے لکھا ہے کہ منظور قادر ہماری اپیلیں تیار کر رہے ہیں۔ اور انہیں جلد مکمل کریں گے۔ اُن کا مشورہ ہے کہ ہم جب تک اور انتظار کریں اس لیئے میں نے سوچا تھا اپنی اپیل کراچی بھیجنے کے بجائے تمہیں بھیجدوں تاکہ منظور قادر سے مشورے کے بعد تم کہو تو اُسے بھیجدیں کہو تو روک لیں۔ لیکن جیل کے حکام نے پیغام بھیجا ہے کہ کسی نامعلوم وجہ سے (اگرچہ اس کا مقدمے کی کاروائی یا کسی اور خفیہ بات سے کوئی تعلق نہیں ہے) یہ تمہیں نہیں بھیجی جا سکتی۔ میں نے وجہ دریافت کی جس کا ابھی تک کوئی جواب نہیں آیا۔ جو ظاہر ہے کہ سرکاری کارگزاری بلکہ عدم کارگزاری کا معمول ہے۔ بہرصورت اب میں نے اِسے روک لیا ہے اور یہ اطلاع اس لیئے بھیج رہا ہوں کہ میرے گزشتہ خط کی وجہ سے کوئی مغالطہ پیدا نہ ہو۔ میں نے اپیل میں جو کچھ لکھا تھا وہ ذاتی نوعیت کا تھا اور قانون یا مقدمے سے متعلق نہیں تھا۔ اب اسے ارسال کرنے کے بجائے میں نے اپنے پاس محفوظ کر لیا ہے شاید کسی کام آئے۔

۸۹

۲۲ مئی ۱۹۵۳ء

پہلے وکیل اور اپیل کی باتیں کریں۔ میں یہ سب کچھ لاہور میں تم لوگوں کے مشترکہ فیصلے پر چھوڑتا ہوں اس لیئے کہ جو کچھ لکھا جائے گا سب کے لیئے مشترک ہوگا۔ اگر محمود علی قصوری وغیرہ کو فیصلہ دیکھنے کی اجازت مل جائے تو اچھا ہے لیکن اگر ایسا نہ ہو سکے تو زیادہ فرق بھی نہیں پڑتا کیونکہ ان اپیلوں کا فیصلہ قانونی بنیاد پر نہیں ہوگا۔ بہرصورت اگر یہ لوگ یہاں آجائیں تو اچھا ہے۔ دوستوں کے چہرے دیکھنے کو ملیں گے اور یہی کیا کم ہے۔

تم نے جس زور شور سے اپنے ڈانٹ ڈپٹ والے فلسفے کی حمایت کی ہے اس سے بہت لطف آیا۔ میں جانتا ہوں کہ دنیا کا کاروبار اِسی فلسفے کی بنیاد پر چلتا ہے اس لیئے اس کی تحقیر کیسے کر سکتا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اپنی طرف سے پہلا پتھر نہ پھینک مارنے کا میرا جو فلسفہ ہے وہ تمہارے فلسفے کے مقابلے میں نسبتاً غیر اہم ہے اور

اس فلسفے سے صرف شاعری پیدا ہوتی ہے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ بڑھیا شاعری ہو لیکن ڈانٹ ڈپٹ کے فلسفے کی پیروی میں بعض اوقات پیچیدہ مسائل کو سادہ بنا کر یک طرفہ فیصلے کئے جاتے ہیں جس سے مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ بعینہ جیسے میرے فلسفے کی پیروی میں سادہ مسائل کو زیادہ پیچیدہ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس سے بھی مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں اختلاف کے باوجود تمہارے فلسفے کا احترام کرتا ہوں لیکن تم میرے فلسفے پر کام کرنے کو قطعی تیار نہیں ہو۔ ہونا بھی ایسا ہی چاہئے ورنہ تمہارے فلسفے کی نفی ہو جائے گی۔ لیکن ہم دونوں مجبور ہیں۔ میں گم کردہ راہ ہوں' بداعمالوں اور نکموں کی امداد کرنے پر ویسے ہی مجبور ہوں جیسے تم انہیں ناپسند کرنے پر مجبور ہو۔ بہتر تو یہ ہے کہ ان دونوں کے فلسفوں کے امتزاج سے کوئی جارحانہ انسان دوستی کا نظریہ تشکیل دیا جائے لیکن یہ تو تمہارے آنے کے بعد ہی ہو گا جب تک ہم دونوں اپنی اپنی پسند اور ناپسند پر قائم رہیں۔ میں نے ابھی فارسٹر کا ناول Howard's end ختم کیا ہے۔ جس میں دو خاندانوں کا بیان ہے جو اسی تضاد کے شکار ہیں۔ ایک طرف جذباتی نہیں ہیں اور دوسری جانب دنیا دار Wilcoxes ۔ نہ جانے تم نے یہ کتاب پڑھی ہے کہ نہیں۔ اب میں اہرنبرگ کا ناول storm پڑھ رہا ہوں جو بہت مفید ثابت ہو رہا ہے۔

سیف الدین سیف کا دیباچہ ملفوف ہے تاخیر کے لئے معذرت کر دینا۔ دیر اس لئے ہوئی کہ میں کچھ بہتر لکھنا چاہتا تھا لیکن دماغ حاضر نہیں ہے۔

ایک مہینہ اور ختم ہو گیا اور منزل آہستہ آہستہ قریب آ رہی ہے۔

۹۰

۲۹ مئی ۱۹۵۳ء

تمہارے بھیجے ہوئے خوبصورت تحفے اور اس سے زیادہ خوبصورت تصویروں کا شکریہ۔ میں تصور میں یہ کھیل دیکھنے اور اس میں تمہاری بچیوں کی اداکاری کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کرتا رہا۔ ان کے لئے یہ بہت دلچسپ رہا ہو گا۔ اسٹیج پر لوگوں کے

سامنے آنے سے بچّوں کی خود اعتمادی میں اضافہ ہوتا ہے۔ البتہ ایک خطرہ بھی ہوتا ہے کہ لوگ زیادہ داد و تحسین سے کسی کو بگاڑ نہ دیں۔ لیکن ان کی اس عمر میں تو ایسا کوئی خطرہ نہیں۔

اب یہاں واقعی گرمی ہے۔ اگرچہ راتیں اب بھی ٹھنڈی ہیں۔ اگلے چند ہفتے شاید ہم کچھ زیادہ نہ لکھ سکیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب جی چاہتا ہے کہ آدمی کچھوے کی طرح اپنے سارے ذہنی اعضاء اندر کو سمیٹ کر صرف ایک بے حس خول کو گرد و گرما کا سامنے کرنے کے لئے چھوڑ دے۔ اس میں پوری کامیابی تو نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ پچھلے ہفتے میں نے کچھ شعر بھی لکھے ہیں۔ لیکن ان دنوں زندگی کی عام روش یہی ہے جیسے شاید پہلے بھی لکھا تھا۔ اس موسم کے کچھ فوائد بھی ہیں۔ دن کا بیشتر حصّہ ایک طرح کی بے ہوشی کے عالم میں بسر ہوتا ہے اور وقت کے گزرنے کا پتہ بھی نہیں چلتا اسی لئے تاریخوں، مہینوں اور دنوں کا حساب سب گڈمڈ ہو جاتا ہے۔

تصویروں اور سگریٹ نوشی کا سامان جو تم نے بھیجا تھا اس کے علاوہ پچھلے ہفتے مجھے ایک عمدہ تحفہ ملا۔ آمنہ نے ہندوستانی مصوّری پر تین بہت لاجواب کتابیں بھیجی ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ انہوں نے خرید کر نہ بھیجی ہوں کیونکہ یہ بہت قیمتی کتابیں ہیں۔

میں نے فرانسیسی نصاب ختم کر لیا ہے اور اب ہسپانوی زبان سے دست و گریباں ہونے کی کوشش کر رہا ہوں۔

۹۱

۸ رجون ۱۹۵۳ء

خط لکھنے کے مقررہ دن صبح میں اپنے سیماب صفت میاں افتخار الدّین اور امتیاز ایک ساتھ آ گئے۔ اس کے بعد ایک اور بہت اچھے ملاقاتی آ گئے[1] یہ مقامی یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ ایک بہت مطلوبہ کتاب بھی میرے لئے ساتھ لائے یعنی سندھ کے عظیم صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی کے تراجم اور بہت سے مشفقانہ اور دلنواز الفاظ

---

[1] ڈاکٹر نبی بخش بلوچ۔

بھی شاعری پر باتیں ہوئیں۔ تعلیمی مسائل کا تذکرہ ہوا اور بہت اچھا وقت گزرا۔ اس سے ایک دن پہلے تمہاری نوعمر سہیلی[1] نے کچھ پھول بھجوائے تھے۔ بہت جی چاہا کہ اُسے دیکھ سکیں۔ غالباً آج کل لاہور میں ہوں گی۔ میرا بہت سا پیار بھجوا دینا۔ نیک بندوں کا شمار اتنا بڑھ چلا ہے کہ سب کا شکریہ ادا کرنے کے لئے مجھے غالباً کئی برس درکار ہوں گے۔ نیک بندوں کا ذکر آیا تو مہربانی سے مجھے قدسیہ[2] کا پتہ بھجوا دو۔ ان کی جملہ مہربانیوں کے لئے شکریے کا خط لکھنا چاہتا ہوں۔ خاص طور سے اس لئے کہ ہم قریب قریب نا آشنا ہیں۔ ویسے اس زمانے میں زیادہ کرم فرمائیاں ان لوگوں ہی نے کی ہے۔

حکیم صاحب[3] نے کتاب کا ارادہ ترک کر دیا ہے تو کوئی بات نہیں آج کل اِکّا دُکّا شعر کے علاوہ میں کچھ نہیں لکھ رہا ہوں۔ فی الحال زیادہ وزنی کام کی سکت نہیں۔ منظورے اپیل کی نقل وصول ہو گئی۔ چونکہ یہ سب کی جانب سے مشترکہ ہے اور گورنر جنرل کو بھجوائی جا چکی ہے۔ اس لئے مجھے اس بارے میں کچھ کرنا نہ تھا۔ میں نے اپنا مسودہ بھی بھجوا دیا ہے اس لئے کہ مضمون واحد تھا۔ میری صحت بالکل ٹھیک ہے۔ صرف دانتوں کا علاج باقی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ خون کے دباؤ وغیرہ کا بھی دوبارہ معائنہ ہو جائے۔

پانچ مہینے گزر چکے۔ منزل اب بھی دور ہے لیکن جلد نظر آنے لگے گی۔ تو درد اور محرومی کے باقی دن بھی کسی صورت گزاریں۔ ان سے پرے بہت سی مسرت انتظار میں ہے۔ بہت سا ہنسنا، بہت سا پیار اور زندگی بہت سے اضافے کے ساتھ وہ سب کچھ لوٹا دے گی جو اس نے ہم سے چھینا ہے۔

---

[1] نام یاد نہیں [2] بیگم قدسیہ زیدی۔ اب انتقال ہو چکا ہے۔ علی گڑھ کے کرنل زیدی کی بیگم۔ [3] ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم۔

۹۲

۱۹ر جون ۱۹۵۳ء

تمہارا خط ملا۔ میرا بھی اب تک پہنچ چکا ہوگا۔ میں کراچی کے لئے سامان باندھ رہا ہوں اس لئے اگلا خط سپرنٹنڈنٹ ڈسٹرکٹ جیل کراچی کی معرفت لکھنا۔ ابھی یہ علم نہیں کہ ہم ہسپتال میں رہیں گے یا جیل میں۔ یہ جگہ اب بالکل اپنا گھر معلوم ہونے لگی ہے۔ اس لئے سفر اور رختِ سفر باندھنا برا لگ رہا ہے۔ لیکن اب کچھ تبدیلیٔ آب و ہوا کو بھی جی چاہتا ہے۔ دانتوں کا علاج بھی ضروری ہے۔ کچھ اور دوستوں کی صورت بھی نظر آئے گی اس لئے دل میں کچھ ہلچل سی ہے۔

ڈاکٹر بلوچ کی صحت یابی کا سن کر خوشی ہوئی۔ ہم قریب قریب ان کے استاد ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہیں اس لئے کہ میں نے The cirrhosis of the liver پر ان کے مقالے کی تصحیح کی تھی۔ جانتی ہو یہ کیا بلا ہے؟ ہم کو سب معلوم ہے۔

تم راحت اور خوشی کے بارے میں اپنے فلسفے پر نظرثانی کر رہی ہو؟ یہ تو بہت اچھی بات ہوئی ہر دوسرے معاملے کی طرح راحت و مسرّت کا بنیادی اصول تو یہی ہے کہ ہاتھ میں آیا ہوا ایک پرندہ جھاڑی میں چھپے ہوئے دو پرندوں سے بہتر ہے (اگرچہ یہ بھی اُمید رکھنی چاہئے کہ شاید جھاڑی والے دو پرندے بھی ہاتھ آجائیں) لیکن دنیا کی بہت سی آبادی نے اس خوف و تشویش کی وجہ سے اس فلسفے پر عمل کرنا ترک کر دیا جو ہمارے موجودہ معاشی اور معاشرتی نظام کی پیداوار ہیں۔ اس نظام میں مستقبل کے بارے میں اتنا دھڑکا لگا رہتا ہے کہ آدمی پوری بے فکری اور کشادِ خاطر سے حال کا لطف لے ہی نہیں سکتا۔ ہمارے آباؤ اجداد کو جو اپنے اپنے رئیسانہ خلوت کدے میں مگن رہتے تھے ایسا کوئی خوف و خدشہ درپیش نہ تھا۔ شاید ہمارے بچّوں کو بھی نہیں ہوگا۔ جب ہماری دنیا کے درد و عذاب کے بجائے کوئی خوش تر نظام وجود میں آچکا ہوگا۔ صرف ہماری نسل وہ "ابن آدم" ہے جس کے مقدر میں لکھا گیا ہے کہ مصلوب ہو کر اپنے لہو سے دنیا کے درد و معصیت کا کفارہ ادا کرے۔ اپنی جان کے لئے اس سے زیادہ گراں قدر خوں بہا کوئی کیا مانگ سکتا ہے۔ اور اس سے زیادہ پر افتخار کون سا کام ہوگا جو وہ اپنے ذمے لے سکتا ہے۔

یہ سن کر افسوس ہوا کہ تمہیں زیادہ ذہنی رفاقت میسّر نہیں۔ لاہور میں ذوق و دانش کا ایسا قحط تو نہیں تھا لیکن غالباً آج کل لوگ محض زندہ رہنے کی مشقت میں اتنے جتے ہوئے ہیں کہ ذہنی کاوش اور سماجی راہ و رسم پر توجہ نہیں دیتے اور پھر شاید میرا خاموش سایہ بھی لوگوں کے سر پر منڈلاتا رہتا ہے اور انہیں زیادہ میل ملاپ سے روکتا ہے۔

کراچی جیل اور جناح ہسپتال کراچی

۸ خطوط

۱۹۵۳ء

خط	تاریخ
۹۳	۲۵/ جون
۹۴	۳۰/ جون
۹۵	۷/ جولائی
۹۶	۱۴/ جولائی
۹۷	۲۳/ جولائی
۹۸	۲۷/ جولائی
۹۹	۱۲/ اگست
۱۰۰	۲۲/ اگست

۹۳

۲۵ ؍ جون ۱۹۵۳ء

تو آخر ہم یہاں پہنچ ہی گئے اور اس وقت خاصا لطف آرہا ہے ایک جیل سے دوسرے جیل میں جائیں تو کافی دیر تک جیل خانے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہم کسی نئے اور اجنبی ملک میں نکل آئے ہیں۔ فی الحال میں بھی یوں ہی محسوس کر رہا ہوں۔ میری رہائش گاہ کچھ جاذب نظر جگہ ہے چھوٹی سی کٹیا جس پر کھپریل کی سرخ چھت ہے۔ پشت پر نازک نازک پتوں والے پیڑ ہیں اور سامنے کے جنگلے پر ایک بہت پھیلی ہوئی بیل اپنے سرخ اور نارنجی پھولوں کی بہار دکھا رہی ہے۔ جب چاند نکلتا ہے تو میرا صحن عشاق کی سیرگاہ معلوم ہوتا ہے۔ کٹیا اور اس میں جھلملاتا ہوا پیٹرومیکس لیمپ پس منظر میں ایک سفید اور سبز دھبّا سا جو میرا غسل خانہ ہے اور سامنے کا جنگلا اور اس کے پھول یہ سب چیزیں جیل کی دیوار پھاند کر کسی اور دنیا میں تحلیل ہو جاتی ہیں اور یوں لگتا ہے کہ ہم جیل میں نہیں ہیں کہیں دیہات کی کھلی فضا میں پڑاؤ ڈالے پڑے ہیں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ چند ہی دنوں میں یہ تاثر زائل ہو جائے گا اور جیل پھر لوٹ آئے گا۔

یہاں جس چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے وہ حیدر آباد کے دوستوں کی صحبت ہے اگرچہ یہاں بھی سہ پہر میں اپنے ہمسایوں سے مل سکتا ہوں لیکن یہ مجمع کچھ عجیب سا ہے۔ البتہ ایک خاصا بھلا سا انگریز قیدی بھی ہے (لندن کا رہنے والا ہے اور اس کا گھر بینڈلسٹن روڈ سے کچھ زیادہ دور نہیں جہاں تمہارے والدین کی قیام گاہ ہے۔ جرم خیانت) اور مولانا عبدالحامد بدایونی سے بھی کچھ انس ہو گیا ہے (وہ ختم نبوت کی تحریک کے سلسلے میں یہاں ہیں۔) اس لئے میرا خیال ہے کہ وقت کٹ جائے گا۔

دراصل مجھے تو اس تنہائی میں کچھ لطف بھی آرہا ہے اور حیدر آباد کی گھما گھمی کے بعد اس خلوت میں آرام اور سکون محسوس ہو رہا ہے۔ اگرچہ اس وقت تک زیادہ سکون تو نہیں مل سکا نو وارد ہونے کے سبب لوگوں کو ہمارے بارے میں تجسّس بھی ہے اور شوقِ ملاقات بھی۔

باہر سے کچھ ملاقاتی بھی آچکے ہیں۔ پہلے جیل خانوں کے انسپکٹر جنرل آئے یعنی ظہیر ہاشمی صاحب۔ پھر سول سرجن کرنل شاہ۔ ان کے ساتھ چیف کمشنر کے ہاں کے ایک افسر بھی تھے۔ میجر

رشید کل آمنہ آئی تھیں اور شیشے کا ایک گلدان چھوڑ گئی ہیں جو اتنا خوبصورت ہے کہ ہر وقت اس کے ٹوٹنے کا ڈر لگا رہتا ہے۔

میرا علاج ابھی شروع نہیں ہوا لیکن غالباً ایک آدھ دن میں شروع ہو جائے گا جب تک میں اسی ہسپانوی کہاوت کے مطابق سستا رہا ہوں۔

۹۴

۳۰ / جون ۱۹۵۳ء

تمہارے دو خط ملے۔ ایک حیدرآباد سے لوٹایا گیا ہے اور دوسرا اخبار کے تراشے کے ساتھ یہاں کے پتے پر ملا۔ شاید یہاں سے میرا پہلا خط کچھ زیادہ ہی شاعرانہ تھا۔ لیکن دو سال کے بعد یہ نقلِ مکان کافی دل خوش کن ہے۔ اگرچہ دل خوش کرنے کا اور کوئی سامان موجود نہیں۔ اب یہ تبدیلی کا احساس بھی گھٹتا جا رہا ہے۔ لیکن نئے منظر میں دلچسپی اب تک باقی ہے اس لئے ابھی اکتا جانے کی نوبت نہیں آئی اگرچہ یہاں اپنے ہم جنس برائے نام ہی دن میں کچھ وقت کے لئے کچھ ملنے والے آجاتے ہیں لیکن ایک آدھ کے علاوہ یہ دوسری قسم کے لوگ ہیں اور سنی اَن سنی کر دینے کا جو ملکہ مجھے حاصل ہے اس سے اکثر کام لینا پڑتا ہے۔ خیر فی الحال مجھے اس سے کوئی الجھن نہیں ہوتی بعد میں شاید ایسا ہو اور تمہارا خیال بالکل غلط ہے کہ یہاں ملاقاتیوں کا تانتا لگا ہوا ہوگا۔ ابھی تک آمنہ کے سوا کوئی بھی نہیں آیا اور میرا خیال ہے کہ کوئی آئے گا بھی نہیں۔ مجھے اس کی ایسی پروا بھی نہیں ہے۔ جیسے جانسن نے کہا تھا۔ ساری دنیا بر تین حرف بجز چند نیک بندوں کے جن کی نیکی باقی مخلوق میں اس جنس کی کمی کی تلافی کر دیتی ہے۔

جیل میں مقامی ڈاکٹر میرا معائنہ کر چکے ہیں۔ مزید معائنہ ایک آدھ دن کے بعد ہسپتال میں ہو گا۔ اچھا ہوا کہ ہم یہاں آگئے کہ دانتوں کے جن ڈاکٹر نے معائنہ کیا تھا وہ کہہ رہے تھے اگر مزید تاخیر ہوتی تو علاج بیکار تھا لیکن ابھی تک کچھ زیادہ نہیں بگڑا ہے کافی ہوشیار معالج معلوم ہوتے ہیں۔ سرکاری کارروائی ختم ہونے کے بعد علاج شروع کریں گے (یہ اس لئے کہ مجھے ان کے کلینک میں جانا ہو گا۔ جس کے لئے محافظ، سواری اور

دوسری بہت سی خرافات کا اہتمام ضروری ہے) بہر صورت جو کچھ کیا جا رہا ہے میں اس سے مطمئن ہوں۔

لکھنے کے جو خاکے ہم اپنے ذہن میں بناتے رہتے ہیں ان میں آج کل ایک یہ بھی ہے کہ اردو میں جمالیات پر ایک کتاب لکھیں اس لیے کہ ایسی کوئی کتاب بازار میں نہیں ہے۔ بہت زمانہ ہوا جیب ہاشمی[1] صاحب نے اس کی فرمائش کی تھی۔ حمید[2] (مکتبہ کارواں والے) سے پوچھو کہ انہیں یہ خیال پسند ہے کہ نہیں اور اگر ہے تو وہ ضروری کتابیں بہم پہنچا سکیں گے یا نہیں؟

۹۵

۷/ جولائی ۱۹۵۳ء

مجھے یہاں آئے ایک ہفتہ ہو چکا ہے اور اس دوران میں بقول بخاری[3] صاحب Caesarian آپریشن کے سوا باقی سب کچھ جھیل چکے ہیں۔ خون کا دباؤ اب معمول پر ہے اور کان اور دانتوں کے سوا اور کوئی شکایت نہیں لیکن خدا گواہ کہ آدمی کی خانہ ویرانی کو یہی کیا کم ہیں۔ مرض تو خیر اپنی جگہ ہے۔ میں علاج کی بات کر رہا ہوں جو مرض سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہے۔ نازیوں نے ایذا رسانی اور عذاب دینے کے جو طریقے اختیار کیے تھے ان کے بارے میں بہت کچھ پڑھا ہے لیکن ان میں "عذاب گوش" کا کہیں ذکر نہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے محبوب مشغلے میں پوری طرح ماہر نہیں تھے۔ ورنہ عذاب و ایذا کی جو صورت یہ عضو بہم پہنچاتا ہے بالکل لاثانی ہے۔ "عذاب دنداں" تو خیر مسلّمہ اور جانی پہچانی چیز ہے لیکن اس کے مقابلے میں ہیچ۔ جیسے تم جانتی ہو اُف کئے بغیر درد برداشت کرنے میں ہم کسی سادھو سنت سے پیچھے نہیں لیکن اب کے میں نے بھی محسوس کیا کہ صبح کان پر کوئی مشق ناز کرے اور سہ پہر کو دانتوں پر — تو یہ کچھ زیادتی ہی ہے۔ خوش قسمتی سے اس عذاب کی زیادہ تکلیف دہ منزل گزر چکی ہے اور غالباً دو تین دن میں یہ قصہ تمام ہو جائے گا۔ جیل خانے سے چھٹی پا کر کچھ ایسا ولولہ تو دل میں پیدا نہیں ہوا جس کی توقع تھی لیکن پھر بھی جب کمرے سے باہر سبزے پر

---

[1] بشیر احمد ہاشمی [2] چودھری عبدالحمید [3] پطرس بخاری

بچّے بیٹھے نظر آتے ہیں۔ اور ان کی ہنسی سنائی دیتی ہے اور آس پاس برآمدوں اور دریچوں میں ایسے چہرے نظر آتے ہیں جن پر اسیری کی خستگی اور کجلاہٹ تحریر نہیں تو دل خوش ہوتا ہے۔

تو تم سارتر کا مطالعہ کر رہی ہو؟ ایک خط میں تو اس موضوع پر بحث بہت طویل ہو جائے گی (اور میں اس بارے میں زیادہ جانتا بھی نہیں) لیکن یہاں میرے پاس ایک کتاب ہے۔ اس کی کافی وضاحت سے تشریح کی گئی ہے۔ تمہیں دے سکتا ہوں۔ یہاں آؤ تو ساتھ لے جانا ورنہ ڈاک سے بھجوا دوں گا۔ ابھی ابھی گزشتہ اتوار کے میگزین سیکشن (پاکستان ٹائمز) میں تمہاری کہانی پڑھی۔ کہانی بہت موثر تھی۔ لیکن میرے خیال میں دوکاندار کو ننھے بچّے کی ماں کے مرجانے کا نہیں بتانا چاہئے تھا۔ اس سے انجام کے بارے میں وہم اور تذبذب ختم ہو جاتا ہے اور انجام یا کلائمیکس کمزور ہو جاتا ہے۔ اگر وضاحت سے بتانے کے بجائے دوکاندار کو مبہم سا اشارہ کر دیا جاتا تو زیادہ اچھا ہوتا اس طرح بچّے کی گھر کو واپسی زیادہ رقت انگیز معلوم ہوتی۔

۹۶

۱۴ ر جولائی ۱۹۵۳ء

اخبارات میں منٹگمری کا ذکر میں نے بھی دیکھا ہے۔ یہ جگہ تمہارے ہاں سے کچھ ایسی دور نہیں اور اسی فاصلے پر کسی اور جگہ سے خاص بری بھی نہیں۔ درون خانہ ایک جیل دوسرے جیل سے زیادہ مختلف نہیں ہوتا۔

پنجاب آنے کے بعد ملاقات کے انتظامات کے بارے میں تردد نہ کرو۔ یہ مسئلہ آسانی سے طے ہو جائے گا۔ میرے کان اور دانتوں کا علاج قریب قریب مکمل ہو چکا ہے اور اب بہت افاقہ ہے۔ دانتوں کے ڈاکٹر کا کلینک وسط شہر میں ہے اس لئے اتنے زمانے کے بعد گلیاں اور بازار، ٹریفک اور بھیڑ بھاڑ دیکھتے ہیں تو کچھ عجیب سا بھی لگتا ہے اور کچھ نہیں بھی لگتا۔ یہ محسوس نہیں ہوتا کہ دو سال تک یہ سب چیزیں نظر سے اوجھل تھیں یہ لگتا ہے کہ ابھی کل ہم ان ہی کے درمیان تھے اور بیچ کے تاریک زمانے کا سایہ کہیں نظر نہیں آتا۔ شاید جس دن ہم جیل سے نکلیں گے جب بھی یہی ہوگا۔ شاید جب بھی یہی محسوس ہوگا کہ ہم ایک آدھ دن کے لئے غیر حاضر ہو گئے تھے اور عمر رائیگاں کا رنج و ملال ذہن سے یکسر محو ہو جائے گا۔

: جانے یہ اچھی بات ہے یا بُری بات ہے۔ اس طرح زندگی کچھ ہموار اور آسان گزار تو ہو جاتی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ متوقع کیف و ولولہ بھی مفقود ہو جاتا ہے۔

شفیع[1] کا لندن والا حصہ کافی دلربا تھا۔ کچھ مفتخر بھی محسوس کیا کچھ ندامت بھی ہوئی اور پھر جی چاہا کہ کچھ زیادہ استعداد اور قابلیت ہمارے حصے میں آئی ہوتی تاکہ ہم بھی کچھ کر پاتے اور اتنے بہت سے لوگوں کی محبت اور احسانات کے مستحق ٹھہرتے۔

۹۷

۲۳ر جولائی ۱۹۵۳ء

اس ہفتے کافی گھما گھمی رہی۔ اوّل تو ہر دوسرے دن دانتوں کے علاج کے لئے شہر کی سیر ہوتی رہی اور بہت سے لوگ ملنے کو آئے۔ آمنہ اور بلّم[2] کئی بار آئیں۔ افتی دو بار آئے اور سب سے دل پسند بات یہ کہ رشیدہ[3] کی بہن جو یہاں مقیم ہیں تشریف لائیں اور کافی دیر ٹھہریں۔ اپنی توقع سے بھی زیادہ اچھی ہیں شاید اکتوبر میں تم سے ملیں گی۔ پھر قدسیہ کا ایک بہت عمدہ خط آیا اور بہت سے آشنا نا آشنا لوگوں کی جانب سے دوستی کے سلام و پیام پہنچے۔ یہ تکلف و کرم ایسا عالمگیر معلوم ہوتا ہے کہ ہم بالکل غرقاب ہو چلے ہیں اس سے شبہ ہوتا ہے کہ یا تو ہم اچھے آدمی ہیں یا بدّھو ہیں۔ ان سب باتوں پر خوشگوار موسم کا بھی اضافہ کر لو۔ بادل آتے ہیں لیکن بارش ہے نہ کیچڑ۔ ٹھنڈک ہے لیکن جھکڑ یا آندھی کا نام نہیں۔ درجۂ حرارت بدلتا رہتا ہے لیکن اعتدال سے۔ ہمارے صحن میں گھاس کا ایک چھوٹا سا قطعہ ہے اور شام کو ننھی سا چاند نکلتا ہے۔ صرف ایک خرابی یہ ہے کہ پڑھنا لکھنا بند ہے اس لئے کہ آج کل ہم استراحت کر رہے ہیں۔ آج کل صرف حافظ اور ڈاکٹر جانسن کو اپنے ہاں باریابی حاصل ہے اس سے زیادہ میں انہیں کیا داد دے سکتا ہوں۔

اور ہاں لوگوں کے بارے میں کچھ زیادہ فصیح اسمائے صفت کا استعمال تم اگر کم کر دو

---

[1] "م۔ ش"۔ [2] شاہین ملک، اب شاہین سعید حسن۔

[3] بیگم خورشید مرزا۔

تو اچھا ہے ان سے خفگی اور برہمی سمجھ میں تو آتی ہے لیکن اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

۹۸

۲۷ر جولائی ۱۹۵۳ء

ہسپتال سے جتنے خط لکھے ہیں کسی کی رسید نہیں آئی (یہ چوتھا ہے) نہ جانے تمہیں پہنچ رہے ہیں کہ نہیں۔ بہرحال میں حسب معمول لکھتا رہوں گا۔ تمہارا آخری خط جس پر ۱۷ر تاریخ درج تھی ۲۴ر تاریخ کو ملا تھا۔ لفافے پر لکھا تھا "ضروری" میں سمجھا اس میں واقعی اہم بات درج ہوگی اس لئے گھبراہٹ میں بہت جلدی سے کھول کر پڑھا۔ لیکن اس میں ایک فرسودہ سوال کے سوا کوئی بھی ضروری یا اہم بات نظر نہیں آئی اور وہ سوال یہ ہے کہ ہم نے ایام ماضی میں اپنی عفت ٹھیک طرح بچا کر رکھی تھی کہ نہیں، لاحول ولاقوۃ، یہ کیا مسخرہ پن ہے" مجھے اس سوال سے شاید برہم ہونا چاہیے تھا یا پریشان ہونا چاہئے تھا لیکن مجھے بے اختیار ہنسی آگئی خیر اس بارے میں اب سوال کا جواب سنو۔

سوال ـ کیا فلاں بنتِ فلاں تمہاری محبوبہ تھیں؟

جواب ـ نہیں۔

سوال ـ تو پھر مری اور کراچی میں کیا ہوا تھا؟

جواب ـ کوئی قابل ذکر بات نہیں ہوئی تھی، کم از کم کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی جسے ہمارے دوست قابلِ ذکر سمجھیں۔

سوال ـ تو پھر آخر کیا قصّہ ہوا تھا؟

جواب ـ اوّل تو سوال مبہم ہے دوم جواب تفصیل چاہتا ہے اور اگرچہ مجھے اس کی چنداں پروا نہیں لیکن ایک نیم پبلک دستاویز میں خالص ذاتی معاملات کا بیان مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

سوال ـ تو تمہیں اقرار ہے کہ یہ کوئی ذاتی معاملہ تھا جسے تم پبلک میں ظاہر نہیں کرنا چاہتے۔

جواب ـ مجھے بالکل اقرار نہیں ہے۔ میں نے صرف یہ کہا ہے کہ ذاتی معاملات پر کھلے بازار بحث کرنا مناسب نہیں۔

سوال ـــ تو تم مانتے ہو کہ اس معاملے کا کوئی نامناسب پہلو بھی تھا۔ دوسرے الفاظ میں کوئی ایسا قابلِ اعتراض پہلو جو پبلک کے سامنے نہیں آنا چاہئے۔

جواب ـــ دیکھئے اب یہ کج بحثی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اوّل تو یہ کوئی قابلِ ذکر قصہ ہی نہیں اور دوم اس کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس پر مجھے ندامت ہو۔

خیر مذاق ایک طرف، اگر سنجیدگی سے بات کریں تو تم یہ موضوع جاری رکھو، کوئی چھوٹا موٹا اسکینڈل نہ صرف زندگی میں چاشنی پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے بلکہ دل بہلانے کے لئے موضوع گفتگو بھی مہیا کرتا ہے بشرطیکہ اس میں کوئی بدمزگی کا مضمون نہ ہو۔ اس کے علاوہ ایسی باتوں پر زیادہ توجّہ دینا بے کار ہے، کم از کم میں تو نہیں دیتا۔

میرے کان کا ابھی تک علاج جاری ہے اور غالباً ابھی کچھ دن یہاں اور رُکنا پڑے گا۔ سب لوگ بہت مہربانی سے پیش آ رہے ہیں۔ اگلے دن آفتاب کی بہن (ڈاکٹر آفتاب احمد ملٹری اکاونٹس سروس میں ہیں۔) سے مختصر سی ملاقات ہوئی تھی ان سے پتہ چلا کہ تم غالباً مری جا رہی ہو، لیکن افتی نے بتایا تھا کہ تمہارے یورپ جانے کا امکان ہے۔ مجھے علم نہیں کہ کون سی بات پوری ہو سکے گی لیکن کچھ بھی ہو تم کچھ دن چھٹی ضرور کر لو جیسا میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں ہمارے حالات میں یہ عیاشی نہیں، بلکہ اشد ضرورت ہے، میری فکر نہیں کرو۔ یہاں سے پنجاب جانے کے بعد اگر ملاقات میں چند دن کی تاخیر بھی ہو گئی تو مضائقہ نہیں، ویسے انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے کہ تم بھی چھٹی کر و اس لئے کہ آج کل ہم بھی چھٹی پر ہیں اور پڑھنا لکھنا سب بند ہے۔

۹۹

۱۲ / اگست ۱۹۵۳ء

اب کے تم نے سب اداس باتیں لکھیں اور یہ سن کر افسوس ہوا کہ تمہاری صحت اچھی نہیں رہی۔ ہماری یہاں اتنی اچھی طرح دیکھ بھال ہو رہی ہے کہ اپنے بارے میں بالکل بے فکر ہو گیا ہوں۔ نہ جانے تمہیں آمنہ نے کس بات پر اتنا ڈرا دیا۔ کان کا

زخم اب بالکل مندمل ہو چکا ہے اور رخصت سے پہلے صرف چند دن کے لئے ڈاکٹر نے زیر ملاحظہ رکھ لیا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے آپریشن کی تجویز ضرور ہوئی تھی لیکن افاقہ ہو جانے پر اور مزید صلاح مشورے کے بعد یہ تجویز ترک کر دی گئی اور آپریشن ضروری نہیں سمجھا گیا۔ میں نے اس بارے میں لکھا اسلئے نہیں کہ تمہیں مزید بیکار تشویش ہو گی اور پھر کچھ قطعی فیصلہ بھی نہیں ہوا تھا جہاں تک غذا اور خوراک کا تعلق ہے وہ میں نے عمداً کم کر رکھی ہے وزن دوبارہ بڑھنے لگا تھا اور میں گھٹانا چاہتا تھا۔ تو دیکھو یہ نہیں کہ میں کچھ چھپا رہا تھا بلکہ پریشانی کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔

اگر مجھے علم ہوتا کہ مجھے ہسپتال میں اتنے دن رہنا ہے تو ضرور تمہیں بلا بھیجتا لیکن یہاں کے قیام کی میعاد شروع سے غیر متعین تھی اور سرکاری فیصلوں کا پتہ چلانا ممکن نہ تھا اس لئے میں نہیں چاہتا تھا کہ سفر پر بیکار پیسے ضائع کرو۔

انتظار ملاقات ناقابل بیان ہے لیکن اس بات سے ڈر لگ رہا ہے کہ تم بیمار اور کمزور نہ نظر آؤ۔ آج کل تو ہمارے لئے تم ہی مرکزِ کائنات ہو اس لئے تمہارا بال بیکا نہ ہونا چاہئے۔ میں تو بہت سخت جان ہوں اور مجھے کوئی زیادہ آزار نہیں پہنچ سکتا۔

اور کیا تمہیں احساس ہے کہ ۵ راگست کی تاریخ گزر چکی ہے جس کے معنی ہیں کہ اب برسوں کا نہیں صرف مہینوں کا حساب کرنا ہے اور کچھ دنوں میں ہفتوں کا حساب باقی رہ جائے گا۔ تمہاری تکالیف کے خیال کے علاوہ اپنا جی ہلکا اور مطمئن ہے وقت توقع سے زیادہ تیزی سے گزر رہا ہے اور دل میں صبحِ فردا کی آوازِ پا سنائی دیتی ہے تھوڑا سا انتظار اور کریں اور خوش مزاجی سے صبحِ فردا کی راہ دیکھتے رہیں۔

۱۰۰

۲۲ راگست ۱۹۵۳ء

ہمارا آخری طبّی معائنہ اور ملاحظہ ہو چکا ہے۔ (سب کچھ ٹھیک ہے) اور میں بستر بوریا باندھے بیٹھا ہوں، لیکن ابھی تک روانگی کے بارے میں کچھ طے نہیں ہوا ہے۔

غالباً کل تک انتظار کرنا پڑے گا امید ہے کہ اس ہفتے کے آخر تک اپنی منزل پر پہنچ جاؤں گا اس لئے انتظار کے دن کم باقی ہیں۔ اب میں یہاں سے جلد لوٹنا چاہتا ہوں اس لئے کہ تم بہت افسردہ معلوم ہوتی ہو۔ ملیں گے تو ہم تمہیں خوش کر دیں گے اس لئے جی مضبوط رکھو اور کسی بات کو بد دلی کا سبب نہ بننے دو۔ یہ وقت بھی گزر جائے گا۔

جیسے ایمان اور خوش مزاجی کے سہارے اپنے وقت پر سب کچھ گزر جاتا ہے ایک تہائی سفر تو کٹ ہی چکا ہے اور ہم گیت گاتے رہیں تو باقی دو تہائی بھی جلد کٹ جائے گا۔

آج کل چاند نکلتا ہے، گداز اور بادلوں سے اداس اداس اور راتیں ایسی حسین ہیں جیسے کوئی درد۔ جب شام ڈھلتی ہے تو میں اپنے عقبی دروازے کے باہر جا بیٹھتا ہوں یا جا کھڑا ہوتا ہوں۔ سامنے ہسپتال کا سبزہ زار ہے اور پرے سڑک کا کچھ حصّہ نظر آتا ہے جو ڈرگ روڈ کو جاتی ہے۔ مہاجروں کی جھگیوں کا ایک جھنڈ ہے اور ایک نارنجی رنگ کے ٹیلے پر میرے سامنے ایک چھوٹا سا مینار ہے جو غالباً پانی یا گیس کی ٹنکی ہے جس کے دندانے دار پہلو میں ایک برہنہ بلب جلتا رہتا ہے اس سے ذرا اونچائی پر ایک اور تیز روشنی ایک تناور درخت کے سبز سینے کو منوّر کرتی ہے اور اس سے آگے کے موڑ پر ایک اور روشنی سے سڑک پر نور کا ایک تالاب سا نظر آتا ہے جس میں کبھی کبھار کسی دوڑتی ہوئی کار اور کبھی کسی سست رو راہگیر کی جھلک لمحہ بھر کے لئے ابھرتی ہے اور پھر غائب ہو جاتی ہے سر پر بادل پیچ و خم کھاتے رہتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ہر حرکت کے ساتھ رات کا موڈ بدل جاتا ہے۔ رات کا چہرہ کبھی روشن مسکراہٹ سے کھل اٹھتا ہے اور کبھی ابدی افسردگی سے دھندلا جاتا ہے اور میں یہ نظارہ کرتا رہتا ہوں کبھی رات کی معیت میں کبھی اکیلے رات سے الگ اور اس میں بہت تسکین ہے اور بہت درد ہے اور دل دونوں کے لئے احسان مند محسوس کرتا ہے۔ درد کے لئے بھی، تسکین کے لئے بھی۔ اس لئے کہ دونوں گواہی دیتے ہیں کہ حالات کے موذی روگ کے باوجود دل زندگی سے بہرہ ور ہے اور اس روگ کے باوجود زندگی خوب اور صحت مند ہے۔

منٹگمری (ساہیوال) جیل

۳۵ خطوط

سال اور تاریخ	خط کا نمبر
۱۹۵۳ء	
اکتوبر	۱۰۱
۱۹۵۴ء	
جنوری	۱۰۲
فروری	۱۰۳، ۱۰۴
مارچ	۱۰۵
مئی	۱۰۶، ۱۰۷
جون	۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱
جولائی	۱۱۲، ۱۱۳
اگست	۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶
ستمبر	۱۱۷، ۱۱۸
اکتوبر	۱۱۹، ۱۲۰
نومبر	۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴
دسمبر	۱۲۵، ۱۲۶
۱۹۵۵ء	
جنوری	۱۲۷، ۱۲۸
فروری	۱۲۹
مارچ	۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳
اپریل	۱۳۴، ۱۳۵

۱۰۱

۲ر اکتوبر ۱۹۵۴ء

تمہیں خط لکھنے بیٹھا تھا کہ وہ خط جو میں نے چھمی کو لکھا تھا لوٹ کر یہاں آ گیا۔ معلوم ہوتا ہے مجھے بھیجے جانے والے لفافے میں چھمی کا خط رکھ دیا گیا۔ تو پھر تمہارے گھر میں ایک ہنگامہ ہی ہوا ہوگا۔ میں اس سے بہت خوش ہوں۔ مطلب یہ کہ خاندان میں ہم ہی اکیلے غائب دماغ نہیں ہیں۔

شاید تمہارا کہنا ٹھیک ہے کہ ہم اتنے زیادہ خط وصول کرتے ہیں اور اتنے کم بھیجتے ہیں جو منصفانہ بات نہیں ہے۔ لیکن قیدی کی کچھ مراعات بھی تو ہوتی ہیں ورنہ جیل خانے سے فائدہ کیا ہے۔

یہ سن کر اطمینان ہوا کہ گزشتہ طوفان سے کسی کو گزند نہیں پہنچا۔ مجھے بہت تشویش تھی اور اچھا ہوا کہ تم نے اتنی جلد خیریت کی اطلاع بھیج دی جس سے تسلّی ہوگئی جیل خانے میں اپنے عزیزوں کے بارے میں تشویش عجب طرح اعصاب پر سوار رہتی ہے اس لئے کہ اپنے بارے میں کوئی فکر ہوتی ہی نہیں۔ اگر گرمی بڑھ جائے یا جاڑوں میں شدت ہو یا پانی زیادہ برسے یا آندھی تیز چلے تو طرح طرح کے وسوسے دل کو پریشان کرنے لگتے ہیں اس لئے کہ ہم کسی کے لئے کچھ کر نہیں سکتے۔ تم ٹھیک کہتی ہو کہ بارش کے بارے میں ہماری قصیدہ خوانی قطعی نامعقول ہے اور جب میں نے گزشتہ بارش کی تباہ کاریوں کا سُنا تو بہت رنج ہوا یہاں تو یہ طوفان کچھ ایسا ناگوار نہ تھا (یعنی جیل خانے کے اندر) لیکن میں تصوّر کر سکتا ہوں کہ باہر کافی مصیبت رہی ہوگی۔

ہمارے بارے میں تمہارے مضمون لکھنے کا یہ کیا قصّہ ہے ہمیں تو اس خیال سے ڈر لگ رہا ہے۔ انگریزی میں کہتے ہیں کہ کوئی شخص اپنے خادم کی نظر میں ہیرو نہیں ہوتا لیکن اپنی بیوی کی نظر میں لاحول ولاقوۃ۔ ان لوگوں نے تمہارے بجائے کسی دوست سے فرمائش کیوں نہیں۔ لیکن شاید میرا کوئی ایسا دوست ہے ہی نہیں جو میرے بارے میں کچھ جانتا ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم کوئی Sloppy چیز نہیں لکھوگی۔

آج کل ہم بالکل قلاش ہیں اس لئے یہ خط ملے تو کچھ پیسے بھجوا دو اور آتی دفعہ

کوئی سو روپے لیتی آؤ۔ میں چاہتا ہوں کہ سال کے خاتمے تک کے لئے پیسے میرے پاس ہوں۔ ماہ بماہ کا حساب ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ مہینہ ختم ہونے کو آتا ہے تو الجھن ہونے لگتی ہے۔

صوفی[1] یا مسعود[2] سے نکلسن کی تاریخ ادبیاتِ عرب کچھ عرصے کے لئے ہمیں عاریتاً دلوا دو۔

۱۰۲

۱۶ر جنوری ۱۹۵۴ء

اس ہفتے نہ تمہارا خط آیا نہ ملاقات[3] آئی۔ یوں لگا کہ کھانے کے بعد سگریٹ نہیں ملا۔ اس جگہ کی بے رونق یکسانیت میں کبھی اس طرح کی محرومی بھی اچھی لگتی ہے اس لئے کہ کچھ بدلتا تو ہے۔ اس کی وجہ سے تھوڑی دیر کے لئے دماغ کی سوئی پھر چلنے لگتی ہے اور دل آرزو سے بیدار ہو جاتا ہے۔

جیل خانے میں ذہنی کیفیات کے جو مختلف دور گزرتے ہیں ان کا ذکر پہلے بھی کر چکا ہوں ان میں سب سے زیادہ ضدّی کیفیت وہ ہے جسے طبّی زبان میں Prison coma کہنا چاہئے۔ ایک طرح کی خمار آلود نیم بیداری۔ جب ہر چیز کہیں دور چلی جاتی ہے اور سب کچھ غیر اہم اور بے وقعت نظر آتا ہے۔ جب کوئی درد باقی رہتا ہے اور نہ کوئی راحت اور عرشِ بریں بے آباد معلوم ہوتا ہے۔ یہ کیفیت بھی گزر جاتی ہے جیسے اور سب کچھ گزر جاتا ہے۔ لیکن جب تک طاری رہتی ہے یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ کبھی ختم نہیں ہو گی۔ اور آدمی کسی ایسے کیڑے کی طرح بن جاتا ہے جو زیرِ زمین بے سدھ پڑا ہو۔

چنانچہ تمہارے جانے کے بعد خیر و خبر سے محرومی اور یہاں کی بے رونقی کو پریشان کر رہی ہے اور اب تو یوں ہے کہ جب آنکھ کھلتی ہے تو اس کا درد نبض کی طرح پھڑکنے لگتا ہے۔ اس بار تمہاری میزی کی وجہ سے بھی جلد کچھ سننے کو جی چاہتا تھا۔ گزشتہ

---

[1] صوفی تبسم [2] ہادی کیٹی والے

[3] "ملاقات آنا" جیل کی خاص اصطلاح ہے۔

ملاقات میں وہ اتنی بے چین اور بے آرام تھی کہ میں گفتگو میں کچھ توجہ نہ دے سکا اور شاید تمہیں کچھ اداس رخصت کیا۔ اتنی چھوٹی عمر میں ان بے چارے بچوں کے لئے اس طرح کا دکھ درد بہت ظلم ہے۔ جب ان کے ننھے دل یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ انہیں کیا دکھ ہے اور کیوں ہے جنگ کے بارے میں جس کتاب[1] کا میں نے ذکر کیا تھا اس میں پانچ برس کے ایک بچے کی بہت دل ہلا دینے والی کہانی ہے۔ جو اپنی تین برس کی بہن کو اٹھائے ہوئے نازیوں کے خوف سے تاریکی میں بھاگا جا رہا ہے۔ بھاگتے بھاگتے تھک جاتا ہے اور اپنی بہن کا بوجھ اٹھا نہیں سکتا، مٹھائی لانے کے بہانے سے اسے نیچے اتار دیتا ہے اور میں بھاگتا رہا' بھاگتا رہا اور رایا کا سوچتا رہا جسے میں اندھیرے میں اکیلا چھوڑ آیا تھا اور میں روتا رہا روتا رہا اور کوئی میری مدد کو نہیں آیا ـــــ لیکن یہ خط تو بالکل رونا دھونا ہوتا جا رہا ہے جو بالکل فضول بات ہے اس لئے کہ ساری تھکن کے باوجود وقت گزر رہا ہے اور سائے چھٹتے جا رہے ہیں۔ جیسا کہ جولیٹ[2] کہتی ہے۔ "ہمارے آنے والے وقت میں یہ ہمارے سارے غم کتنی شیریں گفتگو کا سامان مہیا کریں گے۔"

یہاں ہواؤں میں ابھی سے بہار کی تاثیر بیدار ہو چلی ہے اور کل شام اس موسم میں پہلی بار میں نے کمرے سے باہر رات ڈھلتی ہوئی دیکھی۔ ہوائیں کوئی تیزی نہیں تھی اور چاند مدھم اور مہربان نظر آتا تھا میں بہت دیر تک صحن میں گھومتا رہا۔ نیم تاریکی میں ہماری سرسوں کی باڑھ کا چمکدار سونا روپہلی نظر آ رہا تھا اور پچھواڑے میں سرنگوں درخت دست بہ دعا معلوم ہوتے تھے۔ املی کے کوتاہ قد پیڑوں میں ایک ننھا پرندہ چہچہا رہا تھا اور زندگی کا ذائقہ یکایک شیریں اور لطف انگیز تھا۔ پھر کل شام کراچی سے بہت سے باتصویر رسالوں کا ایک بنڈل آ گیا۔ اس سے بھی بشاشت ہوئی۔ اگرچہ یہ نہیں معلوم کہ یہ کس مہربان نے بھیجا ہے اور کس کا شکریہ واجب ہے۔

---

[1] ایلیا اہرن برگ کی تصنیف Storm۔

[2] شیکسپیئر کے ڈرامے رومیو اینڈ جولیٹ کی ہیروئن جولیٹ

۱۰۳

۲۱ فروری ۱۹۵۴ء

معلوم ہوتا ہے یہ مہینہ بہت جلد گزر گیا۔ شاید موسم کی وجہ سے یا تمہارے آنے کی وجہ سے یا کتابوں کی وجہ سے میں نے ساری کتابیں کھول کر نہیں دیکھی ہیں تاکہ لطف باقی رہے ٹرنر کی ہسٹری آف کورٹ شپ پہلے شروع کی ہے، یہ چٹخارے کی چیز ہے کہ اسے آہستہ آہستہ پڑھ رہا ہوں تاکہ جلد ختم نہ ہو جائے اس کے ساتھ میں نے فلسفے کا مطالعہ بھی شروع کر دیا ہے اور اگر ذہن مصفّا اور تیار ہو تو فلسفہ بھی ایسی ہی مزے کی چیز ہے۔ لیکن جیل میں دماغ زیادہ دیر تک حاضر نہیں رہتا۔ لاہور کے بجلی گھر کی طرح روشنی کبھی جلتی ہے کبھی گل ہو جاتی ہے۔ لیکن جب تک جلتی ہے زندگی یکایک پرلطف معلوم ہوتی ہے۔

موسم وقت سے پہلے گرم ہو چلا ہے اور دھوپ میں بیٹھا نہیں جاتا لیکن اب سائے میں بیٹھ کر یا بستر پر لیٹ کر پڑھ سکتے ہیں جو اچھا لگتا ہے۔ پھر بہت سے پھول بھی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ پھول انسانوں کا بدل تو نہیں لیکن پھر بھی حسین چیز ہیں جو کچھ نہ ہونے سے بہتر ہے۔ البتہ ایسے لمحے بھی آتے ہیں جب آدمی ان سے بھی بیزار ہونے لگتا ہے۔ جیسے ہر بے مقصد حُسن سے اکتاہٹ ہونے لگتی ہے (شاعر[1] کیٹس کچھ ہی کہے) حُسن سے صحیح راحت جبھی بہم پہنچتی ہے جب وہ خلاق ہو۔ یعنی جب وہ اپنے وجود سے دیکھنے والے کے جذبے یا خیال یا عمل میں مزید حُسن کا اضافہ کرے۔ ایک یونانی گلدان[2] جو کسی نظم کا موضوع پیدا نہ کرے اپنے حسن کے باوجود محض ایک ٹھیکرا ہے مٹی کا، خیر یہ اتنی سیدھی بات تو نہیں ہے جیسے میں کہہ رہا ہوں لیکن بنیادی طور سے ایسا ہی ہے۔

۱۰۴

۲۸ فروری ۱۹۵۴ء

کل رات سے مسلسل پانی برس رہا ہے۔ تمام وقت تو خیر نہیں لیکن قریب قریب

---

[1] کیٹس کا مشہور مصرعہ ہے "حقیقت حُسن ہے اور حُسن حقیقت"

[2] کیٹس کی شہرۂ آفاق نظم Ode to a grecian urn یونانی گلدان پر ہے۔

تمام وقت یہی وہ موسم ہے جس کے گُن شاعر لوگ گاتے ہیں۔ (یعنی ہمارے شاعر، تمہارے شاعر نہیں) اور اسکول کے بچے جس کی راہ دیکھتے ہیں تاکہ چھٹی کا مطالبہ کر سکیں کل جب جیلنہ بند تھا لیکن بادل چھائے ہوئے تھے اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی تو دلی بہت یاد آئی وہاں ایسے دن میں حکومت کا جنگی کاروبار قریب قریب برہم ہو جاتا تھا اس لیے کہ آل انڈیا ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل[1] موٹر میں بیٹھ کر دفتر سے کھسک لیتے اور چند کلیدی افسروں کو ان کے دفتر سے اغوا کر کے نہ جانے کس جنگل بیابان میں گھمانے لے جاتے اور اکثر ایسا بھی ہوا کہ میرے افسر اعلیٰ[2] کرنل ڈاڑھی نے اپنی ڈاڑھی نوچ لی اس لئے کہ کوئی بہت ہی فوری اور اہم مسئلہ پیش آگیا اور ان کے سب سے قابل اعتماد اسٹاف افسر کا دور دور پتہ نہ تھا۔ یہ سب کچھ اب کتنا دور لگتا ہے۔ جیسے یہ کسی اور دنیا اور کسی اور زندگی کی بات ہو۔ تم نے اپنے گھر کا ذکر کیا تو اس دُور دراز زمانے کے بعد کی سب اچھی باتیں یاد آئیں۔ گرم جوشی قہقہے اور وہ نیکی اور تقدس جو ہر دوستی اور محبت کا جزو ہے۔ یہ سوچ کر دُکھ ہوتا ہے کہ اب یہ جمگھٹ ہمیشہ کیلئے رخصت ہو چکا ہے جیسے دہلی ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکی ہے۔ لیکن صرف دوستی کے جمگھٹ بدلتے ہیں دوستی اور پیار کا وجود ویسے ہی قائم رہتا ہے اور کبھی نہ کبھی کہیں کسی اور صورت میں پلٹ آتا ہے۔

اگر تمہیں میرے آنے سے پہلے گھر چھوڑنا پڑا تو مجھے بہت کوفت ہو گی۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک بار اپنے ہی گھر لوٹ کر آؤں خواہ ایک ہی دن کے بعد یہ گھر چھوڑنا پڑے جیسے بھی یہ گھر درکار ہے اُسے ایسی بھی کیا جلدی ہو گی کہ چند ماہ بھی انتظار نہ کر سکے۔

۱۰۵

۲۰ مارچ ۱۹۵۴ء

تو ایک طرح سے ہم دوبارہ گھر[3] لوٹ آئے۔ دراصل یہ جگہ واقعی کچھ کچھ گھر معلوم

---

[1] پطرس بخاری مرحوم [2] فوجی محکمۂ تعلیماتِ عامہ کے انگریز سربراہ Col. Beard

[3] مارچ میں طبّی معائنے کی غرض سے فیضؔ کو لاہور لے جایا گیا تھا۔ منٹگمری واپس آنے کے بعد یہ خط لکھا۔

ہوتی ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ ہر چیز سے پرانی جان پہچان دلجمی اور سکونِ خاطر بہم پہنچاتی ہے
چنانچہ ہماری واپسی پر باورچی، دھوبی، خدمت گار، سب لوگ خوشی کے شادیانے بجا رہے
ہیں اور یوں لگتا ہے کہ جیل کے اندر باہر سب چیزیں۔ برتن، دیواریں اور دریچے کی سلاخوں میں
بنے ہوئے پھول پتے بطریقِ آشنائی سلام کہہ رہے ہیں اور اب ہم دوبارہ چین سے بیٹھ
غالب کے ہم زبان ہو کہ کہہ سکتے ہیں سے

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

یہاں تک کا سفر بھی کافی خوشگوار تھا یعنی پولیس کی بند گاڑی میں جس حد تک کوئی
سفر خوشگوار ہو سکتا ہے۔ آہنی جالی کی باریک درازوں سے کبھی لدے پھندے کھیتوں کا
منظر دیکھنے میں آتا کبھی کوئی رُوں رُوں کرتا ہوا رہٹ نظر پڑتا اور کبھی کسی شوخ رنگ لال
نیلی دیہاتی قبا کی جھلک دکھائی دے جاتی۔ لیکن یہ نظارہ کرنا ایسا محنت طلب تھا کہ
گردن اینٹھ جانے کا ڈر ہوتا تھا۔

لاہور کا قیام کافی بدمزہ تھا۔ لیکن یہ تو ہوتا ہی ہے۔ بہر حال ایک مہینہ اور
کٹ گیا اور ہم چند بار مل بھی لئے اس لئے کوئی محل شکایت نہیں۔

۱۰۶

۲۲ مئی ۱۹۵۴ء

یہاں اب اتنی گرمی ہے کہ خدا کی پناہ۔ لیکن میں کچھ زیادہ بے آرام نہیں ہو
ناشتہ کرتے ہی میں اپنے کمرے میں بند ہو جاتا ہوں جو خان عبدالغفار خاں کی مہربانی سے
کافی ٹھنڈا ہے (ہمارے یہاں آنے سے پہلے خان عبدالغفار خان نظر بند تھے) اور
جب ہمارے صحن میں سائے ڈھلنے لگتے ہیں تو باہر نکلتا ہوں۔ اس دوران میں کچھ پڑھتا
لکھتا رہتا ہوں۔ اگرچہ اب بینائی ویسی اچھی نہیں۔ نظر تھک جاتی ہے تو رک رک کر پڑھتا ہوں
جس سے مزے میں فرق آتا ہے۔ لیکن خیر کام چل جاتا ہے۔ میں نے روزن برگ جوڑے

۱؎ امریکن انقلابی کارکن جنہیں صدر ٹرومین کے عہد میں جاسوسی کے جھوٹے الزام میں موت کی سزا دی گئی۔

کے خطوط ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالے۔ اگرچہ بار بار دل زیادہ بھر آیا تو کتاب ہاتھ سے رکھنی پڑی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کے الفاظ کا سوز اور ان کی عظمت اسی ادیب کو نصیب ہو سکتی ہے جس کی مرگ و حیات ایسی ہی عظیم اور دردانگیز ہو۔ ان کا اور ان کے بچوں کا خیال آتا ہے تو اپنی مصیبت کی بات کرنا (اگرچہ یہ مصیبت بھی کچھ کم نہیں) بیہودہ پن معلوم ہوتا ہے۔

آج کل میں فریزر کی کتاب زرین شاخ (Golden Bough) پڑھ رہا ہوں۔ طالب علمی کے دنوں میں سرسری نظر سے دیکھی تھی اور کبھی فراغت سے پڑھنے کو ایک زمانے سے جی چاہتا تھا (اس نوع کی فہرست میں ابھی یہ کتابیں باقی ہیں۔ ہولاک ایلس اور رچرڈ برٹن کی تصنیفات، رادھا کرشن کی تاریخ فلسفۂ ہند اور کنفیوشیس۔ دوستوں کے کتب خانوں میں ان کی تلاش جاری رکھو) میں ختم کر لوں تو فریزر کی کتاب تمہیں بھی پڑھنی چاہئے۔ یہ کتاب ذہنی تعلیم کے لوازمات میں سے ہے۔ خاص طور سے ہمارے جیسے ملک میں۔

شاعری کا یہ ہے کہ دل میں بہت کچھ ہے، کاغذ پر بہت کم۔ جیل کے موضوعات ختم ہو چکے ہیں اور جیل خانے سے کسی نئے خیال کی توقع بیکار ہے۔ جیل سے باہر جو کچھ ہو رہا ہے اس کے بارے میں اشاعت کے لئے کچھ لکھ نہیں سکتے۔ لیکن یہ ثابت کرنے کے لئے کہ ہم بالکل بیکار بھی نہیں بیٹھے ہیں۔ دو مختصر نظمیں بھیجتا ہوں۔ ایک[1] لاہور جیل کا تاثر ہے اور دوسری[2] روزن برگ خطوط سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ ان میں کوئی ایسی کمال کی بات نہیں لیکن شاید وکٹر کو ترجمے کے لئے پسند آئیں۔ مقامی اخبارات میں چھیمی[3] کی صورت نظر آئی۔ دل خوش ہوا۔ نہ جانے شہرت حاصل کرنے کے لئے میزی کیا کرے گی لیکن کچھ نہ کچھ تو وہ بھی کرے گی ہی اور تمہیں پتہ بھی نہیں چلے گا کہ خانہ ہمہ آفتاب کس دن سے ہو گیا۔

---

[1] اے روشنیوں کا شہر

[2] ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے۔

[3] چھیمی کو بچوں کے ایک بین الاقوامی تصویری مقابلے میں پہلا انعام ملا تھا۔

۱۰۷

۲۹ مئی ۱۹۵۴ء

ایک مہینہ اور بیت گیا اور مدّتِ فراق اتنے دن اور مختصر ہوگئی۔ مدّتِ عمر میں اتنے ہی دن کم ہوگئے لیکن اس کی پرواہ کون کرتا ہے۔ دنوں اور لمحوں کا حساب تو صرف رنج و محرومی کے زمانے میں کیا جاتا ہے۔ خوشی اور آسودگی کے لمحات کا شمار کون کرتا ہے جب تو ہر لمحہ دیروز و فردا سے بے نیاز اور اپنی جگہ سالم و ثابت ہوتا ہے۔ جب یہ بھیانک خواب ختم ہوگا اور زندگی نئے سرے سے شروع ہوگی تو اپنے ساتھ بھی یونہی ہوگا جب تن و جان کے کٹے ہوئے رگ و ریشے دوبارہ جڑ جائیں گے اور زخم بھر جائیں گے تو ان کا داغ بھی باقی نہیں رہے گا۔

لکھنے کی کوئی خاص بات نہیں سوائے ان باتوں کے جو لکھ نہیں سکتے۔ گرمی کی وجہ سے انسان، حیوان، دل و دماغ ہر چیز ساکن اور بے حرکت ہے۔ صرف راتوں کا سونا ہے اور صبح کا جاگنا ہے اور باقی اللہ ہو۔ خیر بالکل ایسا بھی نہیں۔ اب بھی کوئی نہ کوئی پھول کھلتا ہے اور سورج کے سامنے سینہ سپر ہو جاتا ہے۔ صبح چند لمحوں کے لئے کوئی پرندہ چہچہاتا ہے اور دل میں کہیں تھوڑی سی جنبش ہوتی ہے جیسے کوئی خواب میں کروٹ لے رہا ہو۔ تھوڑے دنوں کے بعد جادو ٹوٹ جائے گا سب لُسنے کے ماتے چہروں پر برسات کا پانی برسے گا اور جذبہ و خیال گرما کی بے ہوشی سے دوبارہ بیدار ہوں گے چند روز یا چند ہفتے اور پھر ہم گرمی کے اس آخری منحوس موسم سے گزر چکے ہوں گے اور پھر یہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔

اور تمہیں معلوم ہے کل ہم نے روزہ رکھا تھا یعنی سچ مچ کا روزہ شروع سے آخر تک۔ اگلے خط کی باری آنے تک عید آکر گزر چکی ہوگی اس لئے تمہیں اور بچّوں کو اس دن کے لئے پیار۔

۱۰۸

۷ جون ۱۹۵۴ء

جو بہت سی اچھی چیزیں تم نے اور بچّوں نے بھیجی ہیں اور جو مسرّت ان کی معیت

میں آئی اس کے لئے تمہارا اور بچوں کا اب سے پہلے شکریہ ادا کرنا چاہئے تھا۔ اتفاق سے مجھے ان ہی چیزوں کی ضرورت تھی اور اس سے بڑی بات یہ ہے کہ اُن کے سبب سے اپنی عید کی ویرانی احساسِ رفاقت سے آباد ہوگئی اور یہ احساس اب تک باقی ہے

یہ خط میں اپنے "گھر" کے پچھواڑے صحن میں بیٹھا لکھ رہا ہوں۔ دوسری جانب غالباً سورج طلوع ہو چکا ہے اس لئے کہ اوپر بادلوں کا رنگ بدلتا جا رہا ہے اور سامنے پیڑوں اور جھاڑیوں کے رنگ اور خدوخال نمایاں ہوتے جا رہے ہیں۔ میں صبح ساڑھے چار بجے سے یہاں بیٹھا ہوں جب یکایک بارش رک گئی اور سنّاٹے نے مجھے جگا دیا۔ بہت زمانے کے بعد میں نے صبح کو پھر سست قدم آتے ہوئے دیکھا۔ دُور سے مؤذن کی دعوتِ صلوٰۃ سُنی اپنے گرد و پیش "غلام بالوں" کے کواڑ کھڑکھڑانے اور غلاموں کو مشقت کیلئے ہنکانے کی آوازیں آئیں اور ایک طوطے کو اپنی محبوبہ سے محوِ کلام دیکھا۔ بہت سویرے سے ایک مُنّی سی بہت چمکیلی سیاہ، لمبی چونچ والی' نازک پنجوں والی چڑیا زینیا کے پھولوں سے چھیڑ چھاڑ کر رہی ہے۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی ہے۔ صحن کے پیڑ خوش آئند یادوں کی دھن پر جھوم رہے ہیں۔ اور برساتی بادلوں کے گداز سرمئی رنگ پر بیتے ہوئے دنوں کی پھوٹ پڑ رہی ہے۔ میری صبح کا یہ شعر آگیں سماں اب ختم ہونے ہی کو ہے اور میں اپنی یادوں کے ساتھ اب تنہا نہیں ہوں جیل خانہ جاگ اٹھا ہے اور ہمارے باغیچے میں کام کرنے والے قیدی ایک ایک کر کے چلے آ رہے ہیں یہ سب مجھے قدرے تعجب سے دیکھ رہے ہیں اس لئے کہ اس وقت میں عام طور سے بستر میں ہوتا ہوں۔

اور کوئی خاص بات لکھنے کی نہیں ہے۔ گزشتہ ماہ اخراجات زیادہ تھے اس لئے خدشہ ہے کہ مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت پڑے گی۔ آتی دفعہ ساتھ لیتی آنا۔

۱۰۹

۱۳ رجون ۱۹۵۴ء

تمہارا خط دو دن ہوئے ملا تھا۔ اب کے یہ کچھ ایسا بشاش خط نہ تھا۔ لیکن اور مصیبتوں پر اس موسم کا اضافہ خاص مفید صحت نہیں ہے لیکن آؤ اسے یوں دیکھنے کی

کوشش کریں۔ دو دن کے بعد جون کا نصف مہینہ ختم ہو جائے گا۔ دو ہفتے کے بعد گرمیوں کا آدھا موسم گزر چکا ہوگا اور ایک ماہ کے بعد اس موسم کا زیادہ ناگوار زمانہ بیت چکا ہوگا اس کے علاوہ ایک ہفتے کے بعد دن چھوٹے ہونے لگیں گے، راتیں لمبی ہو جائیں گی اور سائے ڈھلنے لگیں گے براؤننگ کے مصرعے یاد ہیں۔ سال کے اس مہینے میں دن بے پناہ طویل ہیں لیکن راتیں۔ کم از کم راتیں. تو مختصر ہیں۔ تم کہو گی کہ یہ بالکل فضول بات ہے ایسی باتوں سے نہ گرمی کی شدت کم ہوتی ہے نہ اپنی مصیبت کا ازالہ ہوتا ہے۔ نہ اس سے گرہ میں پیسے آتے ہیں نہ رنج و عذاب کا خاتمہ قریب آتا ہے۔ الفاظ سے نہ کچھ بنتا ہے نہ بگڑتا ہے۔ شاید تمہارا کہنا ٹھیک ہو لیکن ہمارے پاس الفاظ کے سوا اور رکھا ہی کیا ہے یا پھر جذبات ہیں جو یہ الفاظ تخلیق کرتے ہیں یعنی ایمان اور ہمت اور امید اور پیار اور یہ سب بیش قیمت چیزیں ہیں جن کے سہارے اپنی روح کا افتخار اور اپنے دل کی بشاشت برقرار رکھی جا سکتی ہے تو کیوں نہ ہم اس غرور سے سر اٹھا کر چلیں اور بشاش رہیں۔ گرمی، خالی جیب اور ویران دن جائیں جہنم میں۔

وکٹر کو خط لکھو تو بتا دینا کہ جن خرافات کا وہ ترجمہ کر رہے ہیں اس میں کوئی چیز اس قابل سمجھیں تو نیو اسٹیسمین اینڈ نیشن کو بھجوا دیں۔ بہت زمانہ ہوا جبکہ کنگسلے[۱] مارٹن نے مجھ سے کچھ تراجم کی فرمائش کی تھی اور میں نے کہا تھا کہ ہمارے اشعار اس قابل نہیں ہیں۔ میری رائے تو اب بھی یہی ہے لیکن میری رائے غلط بھی ہو سکتی ہے۔

آج کل میں چاسر پڑھ رہا ہوں۔

۱۱۰

۲۵ جون ۱۹۵۴ء

یہ کچھ خود غرضی بھی معلوم ہوتی ہے اور عیّاشی بھی کہ میں تمہارے تین خطوں کے جواب میں صرف ایک خط لکھ سکتا ہوں۔ لیکن قاعدے سے مجبور ہوں۔ پھر یہ ایک

---

[۱] ممتاز انگریز صحافی ہفت روزہ نیو اسٹیسمین کے بانی اور پہلے مدیر۔ اب انتقال ہو چکا ہے۔

طرح سے محرومی بھی ہے اس لئے کہ عزیز کو خط لکھنے سے بھی بہت سی تسکین اور بہت سی فرحت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ خط لکھنے کی باری آنے تک بہت سے وقتی تاثرات جذبات اور خیالات جو فوری طور سے اظہار کے طالب ہوتے ہیں باسی معلوم ہونے لگتے ہیں اور انہیں رقم کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ جیل میں اور سب باتوں کی طرح یہ بھی غیر اہم اور چھوٹی موٹی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ یعنی کسی صبح کی کیفیت، کسی بادل کا رنگ کوئی گریزاں یاد یا کوئی موزوں جملہ جو ایک دفعہ ہاتھ سے نکل جائے تو جیل کے بے رنگ عدم آباد سے اُسے دوبارہ وجود میں لانا مشکل ہو جاتا ہے۔

نقوش اور دستِ صبا کے نسخے ابھی تک نہیں پہنچے اُمید ہے کہ دوسری چیزوں کے ساتھ جلد بھجوا دوگی۔ مظہر کو یہ پیغام پہنچا دینا کہ اخبار کی پروف ریڈنگ اور سب ایڈیٹنگ پہلے سے بہتر ہے لیکن تمام سب ایڈیٹر حضرات ایک اور بات سے غافل ہو گئے ہیں۔ کبھی بہت پُرانی خبریں چھپ جاتی ہیں اور کبھی ایجنسیوں اور نامہ نگاروں کی خبروں میں بہت سی تکرار ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ۲۱ر جون کے شمارے میں ایک خبر ۱۸ر جون کی تاریخ سے چھپی ہے اور کم از کم پانچ دوسری خبریں دو یا تین دن پُرانی ہیں۔ یہ باسی مال قطعی غیر اہم خبروں پر مشتمل ہے جنہیں حذف کر دینے میں کوئی مضائقہ نہ تھا۔ اسی تاریخ کے امروز میں بعض کافی ضروری خبریں ایسی ہیں جو پاکستان ٹائمز میں نہیں چھپی ہیں۔ کسی ایک خبر میں بھی سول اینڈ ملٹری گزٹ سے پیچھے رہ جانا پاکستان ٹائمز کو زیب نہیں دیتا اور مجھے اُمید ہے کہ مظہر میری تنقید کا بُرا نہیں مانیں گے۔

اس موسم میں سنجیدہ تحریر و مطالعے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا اس لئے آج کل صرف اخبارات رسالوں اور یادوں پر گزر رہی ہے۔ وقت آہستہ آہستہ گزر رہا ہے لیکن آزادی اور تجدید ملاقات کی امید ہمیشہ ساتھ ہے۔ اس دن کی اُمید جب ایام اسیری کی بیکار تلخی دل سے دُھل جائے گی اور مستقبل محبت اور قہقہوں کو جلو میں لئے سکون و مسرت کا ضامن ہوگا۔

۱۱۱

۳۰ر جون ۱۹۵۲ء

شفیع کو میرا سلام اور دوستانہ خط کا شکریہ پہنچا دینا۔ یہ بھی بتا دینا کہ میں خط لکھنے

سے معذور ہوں۔ اس کی وجہ بتا دینا اور یہ بھی کہہ دینا کہ موسم ذرا بہتر ہو جائے تو جس شاہکار کی انہوں نے فرمائش کی ہے اسے لکھنے کی کوشش کروں گا "سویرا" کے مدیر حنیف رامے کو لکھ دینا کہ جو سوالنامہ انہوں نے بھیجا ہے میں اس کا جواب خوشی سے لکھ دیتا لیکن بندش کی وجہ سے نہیں لکھ سکتا۔ اس کے علاوہ ایلیٹ کے مضامین جن پر وہ تبصرہ چاہتے ہیں میرے پاس نہیں ہیں۔

میں یہ لکھ چکا تھا کہ تمہارا خط پہنچا جس میں تم نے اپنے ناشر کے رونے دھونے اور اس سے جدال و قتال کی بات کی ہے اس سے اتنا تو ظاہر ہے کہ اور کچھ بھی ہو ہمیں کاروبار سے کبھی کچھ وصول نہیں ہوگا۔ کاروبار اور نرم دلی دونوں ایک ساتھ نہیں چلتے۔ بہتر یہ ہوگا کہ جو کتابیں بچ گئی ہیں وہ سب لاگت کے دام پر حنیف یا شفیع ہماری جانب سے خرید لیں اور کچھ اپنا منافع رکھ کر بیچ دیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اگر یہ ممکن نہیں ہے تو کسی اور فریق سے اس کا تصفیہ کر ڈالو۔ اگر [1] اتنے ہی قلاّش ہیں تو بہتر ہے کہ وہ کچھ ادا نہ کریں اور اقرار نامے وغیرہ کا دردِ سر میرے ذمے نہ کریں۔ خیرات خیرات ہے اور معاملہ معاملہ ہے وہ خود جو چاہیں انتخاب کر لیں۔

۱۱۲

۲۱ر جولائی ۱۹۵۴ء

تمہارے شاعر نے لکھا تھا نومبر کے مہینے میں جون کا سا کچھ سماں ہو گا۔ جیسے تم کہیں قریب سے گزرے ہو۔ اور یہاں جولائی کے مہینے میں نومبر کا سا سماں ہے ہر چیز کی صورت بدل گئی ہے۔ آسمان دُھلا دھلایا اور شفاف نظر آتا ہے۔ گھاس سر سبز اور کچھ سیاہی مائل نظر آتی ہے۔ ہوا اور دھوپ میں پیار کی سی نرمی اور غروبِ آفتاب کا منظر زرق برق دکھائی دیتا ہے۔ ایسے موسم میں عمرِ عزیز کے زیاں پر دل اداس ہونے لگتا ہے لیکن اس کا شکر ادا کرنے کو بھی جی چاہتا ہے کہ ہم اسے

---

[1] نام عمداً حذف کیا ہے۔

ضائع ہوتے ہوئے دیکھنے کو زندہ موجود ہیں۔ میں ایلیٹ کی نظم پڑھ رہا ہوں۔ وقت جو قاتل ہے وقت جو پالنہار ہے۔ بہت خوبصورت نظم ہے۔ اگرچہ اس سے ایلیٹ جو نتائج اخذ کرتے ہیں بالکل بے سر و پا ہیں۔ مثلاً یہ عمدہ مصرعے سنو۔

Between midnight and dawn, when the past is all deception,
The future, futureless, before the morning watch.
When the time stops, and time is never ending..........

شاید یہ بات بھی کچھ بوگس ہے لیکن اس قدر اثر آفریں۔

گزشتہ ہفتے اسحاق کے لئے آموں کا ایک پارسل آیا تھا جو اتنا بڑا تھا کہ ہم آج صبح تک ختم نہیں کر سکے اور آج صبح کچھ اور آم پہنچ گئے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ میاں اپنے نیک بندوں سے غافل نہیں ہیں اور زندگی کی نعمتیں یہاں بھی میسر آجاتی ہیں۔

میں یہ لکھنا بھول گیا تھا کہ تمہاری اماں کا ایک خط آیا تھا جب تم انہیں جواب دو تو میرا پیار لکھ بھیجنا اور یہ فرمائش کر دینا کہ جب کرسمس کے تحفے کا وقت آئے تو مجھے کچھ بڑھیا قسم کے سگریٹ بھجوا دیں۔ ہم یہاں اچھے سگریٹ کا ذائقہ بالکل فراموش کر چکے ہیں۔ جیل میں دل کتنا حریص ہو جاتا ہے جیسے میز دا اور اس کے آم۔

۱۱۳

۲۷ جولائی ۱۹۵۴ء

کچھ انتظار کے بعد گزشتہ ہفتے تمہارے تین خط یکبارگی آ گئے۔ چنانچہ دل خوش اور مطمئن ہے۔ خاص طور سے تمہارے آخری خط سے گھر کی بہت یاد آئی لیکن افسردگی سے نہیں بلکہ خوش دلی سے۔ وہ اس خیال سے کہ اس سفر کے خاتمے پر کتنی خوش آئند چیزیں اپنی منتظر ہیں۔ جب وہ وقت آئے گا ہم ایک بھرپور محفل نہیں بلکہ کئی محفلیں سجائیں گے۔ البتہ گانے والیوں کے متعلق شاید ہم میں اختلاف رائے ہو اس سے آسکر وائلڈ کا مشہور

مقولہ یاد آ گیا کہ لالچ (Temptation) پر قابو پانے کی واحد صورت یہی ہے کہ آدمی لالچ میں آ جائے۔ یہ مقولہ دراصل آسکر وائلڈ کا نہیں ہے بلکہ چاسر کا ہے اور آسکر وائلڈ صاحب نے اعتراف کئے بغیر اڑا لیا ہے۔ اگر پھر کوئی تمہارے سامنے دہرائے تو اس تصحیح سے تم اپنی علمیت جتا سکتی ہو۔ آم اور تمباکو کا ایک ٹن مل گیا ہے۔ آم اتنے میٹھے تھے کہ ہم ایک ہی دن میں چٹ کر گئے۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا ورنہ ایک، دردناک واقعے کے سبب سے شاید انہیں حلق سے اُتارنا مشکل ہو جاتا۔ جیل میں آنے سے پہلے ہم سمجھتے تھے کہ اسیری کوئی شجاعانہ اور بلند مرتبہ بات ہے۔ اب پتہ چلا کہ اس میں نہ شجاعت کا کوئی مضمون ہے نہ عالی حوصلگی کا۔ اس میں صرف درد ہے اور ناقابل بیان درد اور اس درد کا صحیح احساس مجھے ایک گرفتار شکاری پرندے سے ہوا جس کی کچھ دنوں سے ہم دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ یہ چھوٹا سا ایک شکرا ہے جو کچھ دن پہلے ہمارے غسل خانے میں آ پہنچا اور ہمارے خدمت گار قیدی نے پکڑ لیا۔ سدھانے کے خیال سے قیدی نے اس کی ٹانگ میں رسّی باندھ کے ایک ٹوکرے کے اندر بند کر دیا۔ لیکن اسی شام وہ کسی طرح ٹوکرے سے نکل گیا اور اُڑ کر ہمارے صحن کے ایک درخت پر جا بیٹھا۔ اس کی رسّی شاخوں میں الجھ گئی وہ بے چارا تمام رات پھڑپھڑاتا رہا اور ہم اس کی گلوگیر فریاد سنتے رہے۔ اگلی صبح ہم نے اسے نیچے اتار لیا لیکن اس کی ٹانگ کئی جگہ سے ٹوٹ چکی تھی۔ اب نہ وہ لڑ سکتا ہے اور نہ شکار کر سکتا ہے۔ بیکسی کے عالم میں صحن میں دبکا بیٹھا تھا ایک دن پہلے اس کی آواز سے جن کوؤں چڑیوں اور میناؤں کی جان خطا ہوتی تھی اب وہی پرے باندھ کر اس کے آس پاس جمع ہوتے ہیں اور بہ یک آواز اس کی ہنسی اڑاتے ہیں اور آوازے کستے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس تذلیل پر شکرے کی مغرور چمکدار آنکھیں درد سے دھندلا جاتی ہیں۔ پرندے رو تو نہیں سکتے لیکن اس بیچارے کی بے بسی دیکھ کر دل بھر آتا ہے۔ ہم اُسے اچھی طرح کھلاتے پلاتے ہیں لیکن غالباً دو چار دن میں وہ مر جائے گا۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ نظامِ فطرت میں بے زبان مخلوق کی بے کسی کا علاج یہی ہے فطرت میں ان کے درد کا دارومدار موت ہے۔ یہ صرف انسان کا مقدر ہے کہ وہ اپنا درد اور

اپنے زخم دل میں لئے جیئے جائے۔ سال ہا سال، نسل در نسل، قرن در قرن کیونکہ اس کے درد کا علاج مرنے سے نہیں جینے ہی سے ہوتا ہے اس کے مسائل موت سے نہیں زندگی ہی سے حل ہوتے ہیں اسی خاطر اُسے وہ ایمان اور وہ نظر بخشی گئی ہے جو اس کی ذات سے پرے اور اس کے عہد سے آگے دیکھ سکتی ہے اسی سہارے پر وہ دکھ اٹھائے جاتا ہے اور اُمید کئے جاتا ہے۔ اس دن کی امید جو شاید اُسے کبھی دیکھنا نصیب نہ ہو۔ وہ دن جب سارے غم مٹ جائیں گے، سب درد تھم جائے گا جب رونے کے بجائے ہنسنا ہوگا اور سب آنسو خشک ہو جائیں گے۔ اَن گنت صدیوں کے بعد انسان نے ہاتھ پاؤں سے کام لینا سیکھا۔ انہی صدیوں میں بولنا اور سوچنا سیکھا اور شاید اب وہ وقت قریب آرہا ہے جب وہ خوش رہنا بھی سیکھ لے گا۔ لو یہ تو قریب قریب لکچر ہوگیا ہماری اسکول ماسٹری کی رگ کبھی کبھی یوں ہی پھڑکنے لگتی ہے۔

اب میں پندرہ اگست اور تمہاری آمد کے انتظار میں ہوں۔ صوفی صاحب سے کہنا کہ مجھے فیلن کی لغت تین چار ماہ کے لئے بھجوادیں۔ آج کل میں ہومر کا ترجمہ کرنے کی فکر میں ہوں۔

۱۱۴

۲۵ اگست ۱۹۵۴ء

ایک مہینہ اور گزر چکا اور اس کے بعد جو بھی مہینہ گزرے گا اپنی وضع کا آخری مہینہ ہوگا اور جب لوٹ کر آئے گا تو مختلف اور کہیں گوارا صورت میں آئے گا۔ چنانچہ اب ہر ماہ اپنے آپ سے یہ کہنا کیسا اچھا لگے گا کہ اگست گیا، ستمبر گیا، اکتوبر۔۔۔۔۔ اور دس دن میں جب تمہاری چھٹی شروع ہو جائے گی تو یہ گرمیوں کا موسم بھی بدل چکا ہوگا اور پھر سردیوں میں دن چھوٹے ہو جائیں گے اور جلد گزرنے لگیں گے۔

خرگوشوں کے لئے میزو کی فرمائش سُن کر ہنسی بھی آئی، دل خوش بھی ہوا جب تک دنیا میں ایسی باتیں موجود ہیں، اپنی غیر حاضری ہی میں سہی، کوئی ناخوش کیسے ہو سکتا ہے لیکن تم لوگ خرگوشوں کا خاندان کیسے سنبھالو گے۔ شاید بہتر ہوگا کہ ان کا رنگین طوطوں سے تبادلہ کر لو جو تم نے لکھا ہے کہ کوئی دوست مجھے بھیجنا چاہتے ہیں۔ مجھے یہ پرندے پسند ہیں۔ لیکن میں

قید خانے میں مزید قیدیوں کا اضافہ کرنا نہیں چاہتا اور پھر اس بارے میں مجھے قاعدہ قانون بھی نہیں معلوم۔

مرزا ادیب نے لکھا ہے کہ انہیں کسی زیرِ طبع کتاب کے سلسلے میں میری تصویر اور سوانح عمری درکار ہے۔ اگر پہلے سے علم ہوتا کہ ہمیں شہرت ملنے والی ہے تو بہت سی تصویریں اترواکر رکھ لیتے۔ افسوس! اور سوانح عمری یہ ہے۔ پیدائش سیالکوٹ سنہ ۱۹۱۱ء اور عربی میں ابتدائی تعلیم مولوی محمد ابراہیم میر اور شمس العلماء سید میر حسن صاحب کی مساجد میں حاصل کی، اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور (ایم۔ اے انگریزی ۱۹۳۲ء) اور اورینٹل کالج (ایم۔ اے عربی ۱۹۳۴ء) ملازمت ایم۔ اے۔ او کالج امرتسر ۱۹۳۴ء تا ۱۹۴۰ء۔ ہیلی کالج لاہور ۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۲ء (اسی زمانے میں ادبِ لطیف کی ادارت کی) فوج، مئی ۱۹۴۲ء تا دسمبر ۱۹۴۶ء مستعفی ہو کر پاکستان ٹائمز کی ادارت شروع کی مزدور تنظیموں اور صحافی تنظیموں میں کام کیا۔ تصنیفات دو مجموعے[۱] (۱۹۴۲ء نقشِ فریادی۔ ۱۹۵۲ء دستِ صبا) متفرق تنقیدی مضامین، نشری تقاریر، ریڈیو ڈرامے وغیرہ۔ شادی شدہ بہت سگریٹ پیتے ہیں (آج کل نہیں) اور اس سے بھی زیادہ تضیعِ اوقات کرتے ہیں۔ بس یہی کچھ ہے۔

آج کل ہر طرف سے آموں کی بارش ہو رہی ہے۔ کاش کہ کسی بہتر شئے کے لئے دعاء کی ہوتی۔

۱۱۵

۱۱ اگست سنہ ۱۹۵۴ء

جیل میں جو بہت سی عیدیں آئیں اور گزر گئیں ان میں یہ عید غالباً سب سے زیادہ ویران تھی۔ بالکل بے رنگ اجاڑ دن تھا جس نے کوئی یاد یا آرزو بھی بیدار نہ کی۔ میں نے قیدیوں کی جماعت کے ساتھ نماز ضرور ادا کی (اور یہ کیسا دلدوز منظر ہوتا ہے)

---

[۱] اب کلام کے مجموعوں کی تعداد پانچ ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ مضامین کا ایک مجموعہ "میزان" کے نام سے بھی شائع ہو چکا ہے۔

لیکن اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں کیا۔ صرف ڈان کو ٹکنروٹ پڑھتا رہا اور اب کے سانچو[1] پانزا پر بھی ہنسی نہیں آئی۔ خیر ہٹاؤ۔ اگلے ہفتے تم آؤ گی تو ہم جھوٹ موٹ تہوار کا کچھ سماں پیدا کر لیں گے۔

تمہاری تکالیف کا بہت رنج ہے۔ لیکن اب تھوڑی دیر اور صبر کر لو۔ اگلے ہفتے تمہاری چھٹی شروع ہو جائے گی اور پھر اگلے سال تک تمہیں یوم آزادی نمبر کا درد سر نہ ہو گا۔ نہ گرمیوں کے برے دن گزارنے پڑیں گے۔ اگلے سال جب گرمیوں کا موسم آئے گا تو "چمگادڑ رات" پرواز کر چکی ہو گی۔ ٹینی سن یاد ہے۔

come into the garden, maud

For the black bat night has flown

لیکن آخر ماڈ کیوں؟ سخت فضول اور غیر شاعرانہ نام ہے۔

فلم کے بارے میں کتابیں نہیں مل سکیں تو کوئی بات نہیں لیکن اب کے فیروزسنز کی دکان پر جاؤ تو دیکھنا کہ ڈرائنگ اور مصوری پر کوئی کتابیں آئی ہیں کہ نہیں اور ہومیو پیتھک طب پر کوئی ابتدائی کتاب ہے کہ نہیں۔ دراصل یہ محض ہونا کی آسودگی کا احساس ہوتا ہے۔ خواہ ہم یہ کتابیں پڑھیں یا نہ پڑھیں۔

۱۱۶

۲۵ اگست ۱۹۵۴ء

آج خنک ہوادار دن ہے۔ راحت فزا دن۔ ہوا میں پھر بہار کی سی کیفیت ہے۔ شاید تم کہو گی کہ بہار کے بجائے خزاں کہنا چاہیے لیکن ہمارے ہاں تو صحیح معنوں میں خزاں ہوتی ہے نہ بہار۔ یہ تصورات تو اصل میں سرد ملکوں کے ہیں۔ حتیٰ کہ بہار اور خزاں کے الفاظ بھی ہمارے دیس کے نہیں۔ پٹھانوں اور مغلوں کے وسیلے سے افغانستان اور وسط ایشیا سے آئے ہیں۔ اِن حضرات کے وارد ہونے سے پہلے

---

[1] ناول کا مزاحیہ کردار

ہمارے شعراء تو صرف برکھا رُت جانتے تھے۔ جب کوئل کوکتی ہے،' آم کے پیڑوں پر بجلی کڑکتی ہے اور کوندا لپکتا ہے' پھر اس زمانے میں ہمارے ہاں نہ گلاب تھا نہ نرگس نہ بلبل نہ خوبانی نہ انار صرف کوئل تھی اور تلسی اور مولسری اور صندل۔ اس اعتبار سے ہمارے شعراء کو اب تک کارنیشن اور کوکا کولا اور شنیل کا تذکرہ شروع کر دینا چاہئے تھا لیکن بدقسمتی سے اب ہمارے شاعر کو وہ مراعات حاصل نہیں جو پہلے تھیں اور تعیش کا نیا سازو سامان اسے شاید ہی کبھی میسّر آتا ہے۔

میں یہ سننے کے لئے منتظر ہوں کہ چھوٹی[۱] والی کی سالگرہ کیسے گزری اور اسے میرا تار ملا یا نہیں۔ ایسے دنوں پر اپنی غیر حاضری کا رنج ہے لیکن اگر ایسے دن میں بچوں کا دل کچھ خوش ہو گیا تو اپنی خوشی یا ناخوشی کوئی ایسی بات نہیں۔ مستقبل میں کافی وقت رکھا ہے۔ جب ماضی میں جو کچھ کھویا ہے اس کی تلافی ہو جائے گی۔ یہ شاید کچھ احمقانہ سی بات ہے اس لئے کہ مستقبل کبھی ماضی کا بدل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے نہیں ہو سکتا کہ ماضی کبھی لوٹ کر نہیں آتا لیکن کہنے سے مُراد یہ ہے کہ مستقبل میں شاید ذہنی راحت اور طمانیت نصیب ہو تاکہ ماضی کی محرومیوں کا درد و تاسف دل سے محو ہو جائے۔ اگر آدمی اپنے حال سے خوش ہو تو وہ ماضی کی جانب کم نظر کرتا ہے اور ماضی میں جو کچھ بھی جھیلا ہو اسے فراموش کر دیتا ہے۔

لوازش[۲] کی وفات کا سُن کر بہت قلق ہوا۔ صرف اتنی خبر سُننے میں آئی کہ موٹر کا حادثہ ہو گیا تھا۔ تفصیلات کا پتہ نہیں چلا۔ ان کے بھائی کو میری دلی تعزیت پہنچا دینا۔ میں نے خبر سُنتے ہی اِن کے گھر زبانی پیغام بھجوایا تھا۔ لیکن ممکن ہے انہیں نہ مِل سکا ہو۔

اب موسم ذرا بہتر ہوا ہے تو میں نے دوبارہ کام شروع کر دیا ہے۔

---

۱ میزی۔

۲ صاحبزادہ لوازش علی جنہوں نے فیض کی طرف سے وکالت کی۔

اِبسن کے ڈرامے Pillars of the community کا نصف کے قریب ترجمہ کر چکا ہوں۔ لیکن یہ اُردو زبان ہے بہت دردِ سر۔ پہلے ہی لفظ کمیونٹی پر بات اٹکی ہوئی ہے۔ یعنی ایک ہی شہر یا محلّے میں رہنے والے لوگوں کا گروہ۔ مہربانی سے حسرت[1] یا امتیاز[2] یا خواجہ منظور[3] سے پوچھ کر لکھو کہ کونسا لفظ موزوں ہے۔ مجھے عربی فارسی کا کوئی عالمانہ لفظ نہیں چاہیئے۔ وہ تو میں خود بھی تلاش کر سکتا ہوں۔ کوئی روزمرّہ عام بول چال کا لفظ چاہیئے۔ چند الفاظ اور بھی پوچھنے کے ہیں لیکن وہ پھر کبھی سہی۔

۱۱۷

۴ ستمبر ۱۹۵۴ء

بے چاری میزو اور اس کے کھٹمل۔ مجھے تمہیں پہلے سے متنبہ کر دینا چاہیئے تھا اسلئے کہ ایبٹ آباد کے کھٹمل شہرۂ آفاق ہیں۔ مجھے یہ اُن دنوں سے یاد ہیں جب میں بچپن میں ایک بار ایبٹ آباد گیا تھا۔ جب سے ابتک اتنا زمانہ گزر چکا ہے۔ لیکن ابھی کل کی بات معلوم ہوتی ہے۔ حمید[4] بھائی کی اکلوتی بہن جو بہت خوبصورت تھیں اور جوانی میں فوت ہوگئیں۔ اِس علاقہ میں بیاہی ہوئی تھیں۔ میں اور بیچارے طفیل اِن کے ہاں گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے گئے تھے۔ اُن کے شوہر پیر صاحب ایک دن ہمیں ایبٹ آباد کی سیر کو لے گئے۔ وہاں کھٹملوں نے اِس بری طرح کاٹا کہ مجھے بخار آگیا اور کئی دن بستر میں رہنا پڑا۔ میں نے اِس سے پہلے پہاڑ، پہاڑی ندیاں اور چشمے کبھی نہ دیکھے تھے اور یہ سب کچھ کتنا کیف آور تھا۔ حجرے کے صحن میں میری چچازاد بہن کے شوہر جو مقامی خان تھے۔ پستول نشانہ بازی کی مشق کر رہے ہیں۔ گھر کے اندر دالان میں دیواروں پر طرح طرح کی تلواریں، خنجر اور پیش قبض سجے ہیں۔ پیر صاحب کی بوڑھی اماں تعویز گنڈے کر رہی ہیں اور جب مرد اِدھر اُدھر ہوں تو گاؤں کی حسینائیں پہاڑی ندی میں نیم برہنہ نہا رہی ہیں۔ کتنے دکھ کی بات

---

[1] چراغ حسن حسرت [2] امتیاز علی تاج [3] سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج، لاہور

[4] خان صاحب چودھری عبدالحمید، فیض کے بہنوئی اور چچازاد بھائی۔

ہے کہ جن لوگوں سے یہ یادیں وابستہ ہیں اُن میں اب کوئی بھی زندہ نہیں ہے۔ نہ میری بہن نہ اِن کے شوہر، نہ پیر صاحب نہ ان کی اماں نہ میرا بھائی۔ لیکن شاید جب تک کوئی کسی کی یاد میں زندہ ہو اُسے مُردہ نہیں کہنا چاہیئے۔ اور اگر یہ سب لوگ آج زندہ ہوتے تو شاید اِن کی یاد اتنی روشن اور تابناک نہ ہوتی جیسی کہ اَب ہے۔

البسن کا ترجمہ اب تک جاری ہے لیکن اب اس سے کچھ اُلجھن ہونے لگی ہے۔ پوری صحت سے ترجمہ کرنا بہت ہی عرق ریزی کا کام ہے جس میں تخلیقی کام سے بھی زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔ لیکن اُمید ہے کہ اب یہ ختم ہو جائے گا۔

۱۱۸

۲۴ ستمبر ۱۹۵۴ء

اس وقت چھما چھم پانی برس رہا ہے۔ آج کی صبح بہت ہی نظّارہ پرور صبح تھی بہت سویرے کالے، نیلے، سرمئی، فالسئی بادل گھر آئے اور چاروں اُور آسمان پر چھا گئے۔ پھر ہمارے سبزے پر یکایک بہت سے نئے ملاقاتیوں کا تانتا لگ گیا۔ ننّھی منّی طرح طرح کی خوبصورت چڑیاں تھیں۔ کچھ سیاہ اور سرمئی موزوں رنگوں میں ملبوس جن کی دُم کے نیچے سُرخ اور زرد بنڈّیاں تھیں۔ کچھ سنہری، سبز رنگ کی جن کی دُم سے باہر ایک مہین لمبا سا پَر نکلا ہوا تھا اور آنکھوں کے نیچے کاجل کی سی لمبی سیاہ لکیر عجب شوخی اور طرّاری کا پتہ دیتی تھی۔ پھر طوطوں کا ایک غول آیا اور شور مچاتے ہوئے گزر گیا۔ دھیرے دھیرے ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ اور سب پیڑ پودے منتظر اور آرزومند نظر آنے لگے۔ پھر بارش آئی۔ پہلے بوندا باندی کی صورت میں اور پھر موسلا دھار۔ بہت زمانے کے بعد یہاں پر یہ پہلی بارش ہوئی ہے۔ اگرچہ بارش کے آثار کئی دن سے تھے۔ ہر روز بادل آتے، ٹھنڈی ہوا چلتی اور دن کی رنگت جیسے دُھل کر نکھر جاتی۔ شام کا آسمان کسی مصوّر کی رنگ آمیزی کا تختہ معلوم ہوتا۔ کسی زمانے میں اس طرح کے دِن سے دل میں درد حسرت کا ہجوم ہونے لگتا تھا۔ لیکن اب کم ہی ایسا ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ یہ سب حُسن کوئی فضول اور دُور از کار چیز ہے جس سے ہمیں کوئی واسطہ نہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ

فطرت کسی انسانی تجربے یا مقصد (جسمانی، جذباتی، مادّی یا جمالیاتی) کے واسطے ہی سے حُسن افزا ہوتی ہے۔ اور جیل خانے میں جان و تن کا رشتہ بہم رکھنے کے علاوہ نہ کوئی مقصد ہوتا ہے نہ مقصود۔ نہ ارادہ نہ عمل، تمنّا نہ تسکین اور اسی وجہ سے کسی چیز میں دلچسپی نہیں رہتی۔ باہر کی اہم باتوں کا ذکر نہیں، آس پاس کی چھوٹی موٹی چیزوں سے دل اُچاٹ ہو جاتا ہے۔ خیر بالکل ایسا بھی نہیں ہوتا اس لئے کہ فطرت چھوٹے موٹے خوشگوار (اور کبھی ناگوار) اچنبھے پیدا کرتی رہتی ہے اور زندگی سب کی باتوں کے باوجود بہر حال غنیمت معلوم ہوتی ہے۔ نہ جانے اس خرافات کے کچھ معنی ہیں کہ نہیں کہنا صرف یہ تھا کہ موسم بہت خوشگوار ہے۔

ـــہ کے رشتے کے بارے میں یہ ہے کہ بظاہر موصوف مخلص آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ یقین سے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ بعض اوقات انسان اپنے جذبات کے بارے میں بھی دھوکہ کھا سکتا ہے اور ہر شادی کے ساتھ کوئی نہ کوئی خدشہ تو لگا ہی رہتا ہے۔ اس لئے میں تو اس رشتے کے حق میں ہوں۔ اگر خدا نخواستہ شادی کامیاب نہ بھی ہو جب بھی صورتِ حال موجودہ صورت سے کچھ ایسی بدتر نہ ہوگی اور اگر کامیاب ہو گئی جیسے کہ ہونا چاہئے تو دونوں کو بہت سی مسرّت حاصل ہوگی اس لئے تم اس بارے میں کوشش جاری رکھو۔ تم نے پوچھا ہے کہ دوسروں کی زندگی میں دخل دینا چاہئے کہ نہیں۔ میں کہتا ہوں ضرور دینا چاہئے بشرطیکہ آدمی دیانت داری سے محسوس کرے کہ اس سے کسی کا بھلا ہو سکتا ہے۔ البتہ اگر نیک نتیجہ برآمد ہو شکریئے یا احسان مندی کی توقع نہ رکھنی چاہئے اور نتیجہ برعکس ہو تو سب الزام اپنے سر لینے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ میرے ساتھ ایسا کئی بار ہو چکا ہے لیکن مجھے اس کا ذرا بھی تاسف نہیں۔ اس کھیل میں ایسے ہی ہوتا ہے ظاہر ہے آدمی یہ کھیل کھیلنے پر مجبور نہیں لیکن یوں دیکھئے تو آدمی اپنے سوا کسی کے لئے کچھ بھی کرنے پر مجبور نہیں اور اس کے باوجود کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہتا ہے۔

ـــہ نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔

۱۱۹

۹ر اکتوبر ۱۹۵۴ء

آج صبح جب میں ناشتہ کرنے بیٹھا تو یکایک بدر کی یاد آئی اور دل بلبلا اٹھا میں بہت دیر تک کچھ افسردگی سے سوچتا رہا کہ انسانی دوستی کیسی فانی اور بے حقیقت شئے ہے اور انسان کا دل کتنا ناشکرا ہے۔ بدر[1] غالباً ہمارا واحد مخلص دوست تھا لیکن ہم نہ کبھی اس کے گھر گئے ہیں نہ کبھی اس کے بیوی بچّوں کی خبر لی ہے' یوں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہی ٹھیک ہے اور ایسے ہی ہونا چاہئے۔ مرنے والے کیسے بھی عزیز کیوں نہ ہوں بہر حال زندگی سے لاتعلّق ہیں۔ اس لئے انہیں بھول جانا ہی بہتر ہے۔ لیکن مجھے یقین نہیں کہ یہ صحیح ہے۔

جو مرنے والے یادمیں زندہ ہوں کیا وہ جینے والوں کی زندگی ہی کا جزو نہیں ہوتے اس لئے کہ یاد ایسی ہی حقیقی شئے ہے جیسے کوئی دوسرا ذہنی تجربہ یا واقعی ملاقات' پھر کیا یہ بہتر نہیں کہ مرنے والوں کی نیکی جینے والوں کی یادداشت میں ایک مثبت اور مؤثر عنصر کے طور سے زندہ رہے۔ بشرطیکہ اس یاد سے جو درد وابستہ ہو اسے کسی طور سے الگ کیا جا سکے۔ یہ شرط اس لئے ضروری ہے کہ جو درد موت جیسی لاعلاج چیز سے وابستہ ہو وہ بے کار اور بے مقصد شئے ہے اور بے مقصد دُکھ اُٹھانا حوصلہ شکن بھی ہوتا ہے۔ غیر اخلاقی بھی۔ بہرحال کسی دن صوفی یا حسرت کو ساتھ لے کر بدر کے گھر والوں سے مل آنا۔

تم نے آنے میں اتنی تاخیر کی ہے تو جُرمانے کے طور پر ایک آدھ اور فرمائش بھی ہے۔ ایک تو ہمیں دیسی کھانے پکانے پر کوئی کتاب چاہئے۔ اگر کوئی اور ملازمت نہ ملی تو شاید باورچی بننا پڑے اور جیسے میں لکھ چکا ہوں مستقبل کے بارے میں خاطر جمع رکھو۔ ہم ساتھ ہوں گے تو کوئی بھی ایسی مشکل نہیں جس کا ہم سامنا نہ کر سکیں یا جس پر قابو نہ پا سکیں' اگر تھوڑا سا بھی امن' سلامتی اور پڑھنے لکھنے کی آزادی میسّر ہو تو میں کہیں بھی ملازمت کو تیار ہوں ٹمبکٹو ہی میں کیوں نہ ہو' خیر مجھے روزی کمانے کی فکر نہ کبھی پہلے دامن گیر ہوئی ہے نہ اب ہے اس کیلئے صرف صحیح دماغ درکار ہے اور دو ہاتھ اور یہ لوازمات اپنے پاس موجود ہیں

---

[1] بدرالدّین بدر' مرحوم ادیب اور صحافی پُرانے دوست۔

۱۲۰

۱۵ر اکتوبر ۱۹۵۷ء

نہ جانے یہ خط تمہارے روانہ ہونے سے پیشتر پہنچ سکے گا یا نہیں۔ خیر کچھ ایسا فرق نہیں پڑتا۔ بہت سے اُردو رسائل مل گئے ہیں جن سے کچھ وقت کٹ جائے گا اگرچہ یہ سب افسردگی کا سامان ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ تحریروں کا معیار اچھا نہیں۔ وہ تو اچھا ہے اور ہمارے نوجوان لکھنے والے کافی ماہر معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان کی تحریروں میں نمائش اور تکلّف کچھ زیادہ ہے۔ لیکن یہ سب کے سب اتنے اُداس اور دل شکستہ کیوں ہیں؟ بیشتر افسانوں اور بہت سی نظموں میں وہی ویران زندگیوں اور ٹوٹے ہوئے دلوں کا ماتم ہے اور اس بات کا رونا کہ ہر شئے ایسی لعنتی اور مکروہ کیوں ہے۔ یہ پڑھ کر چلاّنے کو جی چاہتا ہے کہ خدا کے لئے کبھی تو خوشی کی بھی کوئی بات کرو۔ ہر شئے مکروہ اور جہنمی ہی سہی، ساتھ ہی کچھ الزام اپنے کو دینا پڑتا ہے کہ ان میں سے بعض فیلشن تو میں نے ہی چلائے ہیں لیکن ہم تو جیل خانے میں ہیں اور یہ لوگ آزاد ہیں، یہ جوان ہیں، ہم بوڑھے ہیں اور ان کے سامنے امید اور یقین کے ایسے بنے بنائے نقشے موجود ہیں جو ہم نے برسوں کی ذہنی اور جسمانی اذیّت اور کاوش کے بعد دریافت کئے تھے۔ پھر یہ لوگ اتنے مایوس اور ملول کیوں ہیں؟ یہ صحیح ہے کہ اپنے گرد و پیش زندگی کافی اُجاڑ اور بے رونق ہے لیکن اپنے حال میں ماضی بھی شامل ہے اور مستقبل بھی اور اپنی دنیا کی حدود ساری سرزمینوں اور سارے سمندروں پر محیط ہیں۔ ان سب پر نگاہ کی جائے تو یقیناً دل میں کچھ ولولہ پیدا ہونا چاہئے اور اپنے وقتی اور ذاتی دُکھ کے اُفق سے پرے دیکھ سکنے کی توفیق میسّر آنی چاہئے۔ خاص طور سے اگر آدمی تندرست اور نوجوان ہو۔ کچھ لوگ کبھی کبھی یہ بات بھی کرتے ہیں لیکن محض عقیدے یا نظریے کے طور سے جس میں خلوص اور صداقت کا ثبوت نہیں ملتا۔ میں خود ہی کچھ لکھنا چاہتا ہوں لیکن ٹھیک ہے اس کا ڈھب نہیں آتا۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی اور ایسے مضامین لکھ کر دکھائے تو پھر ہم بھی لکھیں اور وہ غالباً اس انتظار میں ہیں کہ ہم لکھیں تو وہ بھی لکھیں جو بہت کوفت کا مضمون ہے۔ خیر!

آج کل پھر جیل کی نیم بے ہوشی کا سا عالم ہے، دن جیسے سرک اور رینگ کر گزر رہے ہیں اور اکثر یاد نہیں رہتا کہ ہفتے کا کونسا دن اور مہینے کی کونسی تاریخ ہے۔ خیر یہ اذیت بھی جلد گزر جائے گی۔

۱۲۱

۴ر نومبر ۱۹۵۴ء

۱۲ تاریخ کو حسب وعدہ سرور اور بچے آئے تھے، وہ بہت کم وقت ٹھہریں اور ہم زیادہ بات نہ کر سکے لیکن مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ وہ بہت غمزدہ نہیں ہیں اور ہم نے اپنے غم کا ذکر بھی نہیں کیا، صرف بچوں کو دیکھ کر دکھ ہوا اس لئے کہ ماں باپ کا تو کوئی بدل دنیا میں نہیں ہوتا اور یہ کتنے ظلم کی بات ہے کہ ننھے ننھے دل اس فراق کا داغ عمر بھر کے لئے اپنے ساتھ لئے پھریں۔

ہاں مجھے ۲۸ر اکتوبر کی تاریخ یاد تھی (ہماری شادی کی سالگرہ) میں نے یہ دن یوں منایا کہ تمہیں پیار اور ان سب خوشیوں کا شکریہ بھیج کر جو ہمیں ایک ساتھ نصیب رہی ہیں، سرِ شام سو گیا، اب مجھے پہلے سے بھی زیادہ پکا یقین ہے کہ بہترین دن ابھی دیکھنے باقی ہیں، موجودہ رات کے سائے ڈھل جانے کے بعد لمبے روشن دن جب "راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔" ایسے دنوں کا سوچتا ہوں تو مجھے اتوار کا وہ دن یاد آتا ہے جو میں نے صبح سے شام تک لاج[1] میں گھاس پر لیٹے گزارا تھا، یہ یاد اس وقت زیادہ روشن اس لئے ہے کہ آج پرانے کاغذات میں سے اے۔ ایس۔ بی کا ایک خط برآمد ہوا جو انہوں نے لندن سے تمہیں لکھا تھا، جب تم آؤ تو یاد سے ساتھ لیتی جانا، میں چاہتا ہوں کہ یہ محفوظ رہے۔

۱۲۲

۱۱ر نومبر ۱۹۵۴ء

اس وقت شام کے پانچ بجے ہیں، دن ڈھل رہا ہے اور چند ہی لمحوں میں دیواروں

---

[1] پرنسپل گورنمنٹ کالج کی اقامت گاہ جہاں ایک زمانے میں پطرس مقیم تھے۔

اور درختوں پر تانبے اور کانسی کے رنگ کی روشنی کی آخری کرن بجھ جائے گی۔ پھر پرندوں کی آوازیں گنگ ہو جائیں گی اور وقت ٹھہر جائے گا۔ جس دن بیڈمنٹن کا کھیل نہ ہو یہ کافی بُرا وقت ہوتا ہے۔ نہ اتنی روشنی موجود ہوتی ہے کہ باہر بیٹھ کر پڑھ سکیں نہ اتنا اندھیرا کہ بجلی روشن کر سکیں (ویسے یہ ہم کر بھی نہیں سکتے اس لئے کہ دن میں بجلی بند رہتی ہے اور شام میں کافی دیر سے کھلتی ہے) اس وقت اگر آنکھیں الفاظ شناخت کر بھی سکیں تو دماغ ان کے معنی وصول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس وقت سوچ بچار کرنا بھی اچھا نہیں اس لئے کہ گزرے ہوئے دن کی خاموش جانکنی خیالات کو افسردگی میں رنگ دیتی ہے۔

ہمارے ہاں اس وقت کے تعلق سے جو تصورات وابستہ ہیں اب میں انہیں زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔ یہ وہ وقت ہے جب ہمارے محاورے میں "دونوں وقت ملتے ہیں" دن کی پراسرار گھڑی۔ جب کنواریوں کو کھلے میں ننگے سر کھڑے ہونے سے منع کیا جاتا ہے، جب کوئی نیا کام شروع نہیں کیا جاتا، نہ کوئی مُردہ دفنایا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض لوگ تلاوت بھی نہیں کرتے، یہ عقائد تو اس زمانے سے چلے آرہے ہیں جب سورج ایک زندہ دیوتا مانا جاتا تھا اور اندھیرا ایک زندہ عفریت۔ اب یہ دیوتا اور عفریت تو مر مرا چکے لیکن جاں بلب دن کی افسردگی اب بھی حقیقت ہے جو اس وقت تک باقی رہتی ہے۔ جب تک رات اس کی موت کا یقین اور اگلی صبح کی پیدائش کی اُمید ساتھ لئے آ نہیں چکتی۔

چنانچہ جس دن بیڈمنٹن نہ ہو میں مسلسل چلتا رہتا ہوں اور صحن کے چکر کاٹتا رہتا ہوں بالکل کولہو کے بیل کی طرح اور اپنا ذہن بھی ویسے ہی خالی ہوتا ہے۔ آج یہ وقت ذرا جلد گزر گیا اس لئے کہ میں یہ خط لکھ رہا ہوں اور اب اندھیرا اتنا بڑھ گیا ہے کہ زیادہ نہیں لکھ سکتا، بجلی آئے گی تو باقی لکھوں گا یا کل صبح سہی۔

جمعرات

میں کل رات یہ خط ختم نہ کر سکا، اس کے بجائے میں لڑکیوں کے لئے ایک پُرانی کلاسیکی کتاب پڑھتا رہا جو میں نے بھیجی کے لئے تجویز کی تھی، پُرانی وضع کی کتاب

ہے لیکن بہت دل آویز، افسوس کی بات ہے کہ بچّوں کے لئے جو بھی اچھی کتابیں لکھی گئی ہیں وہ سب نصف صدی یا اس سے زیادہ پُرانی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کتابیں ایک مختلف ماحول اور فکر و خیال کی مختلف فضا میں لکھی گئی تھیں۔ اس لئے ہر چند تجربہ بہت عمدہ ہے بعض خیالات اب بالکل اوٹ پٹانگ معلوم ہوتے ہیں۔ بچّوں کا ادب ایسی اہم چیز ہے کہ میں سنجیدگی سے سوچتا ہوں خود ہی لکھنا شروع کردوں۔ لیکن آج کل تو میں سنجیدگی سے بہت کچھ بننے کا سوچ رہا ہوں، مدرّس، آرٹسٹ، باورچی، مالی، فلم پروڈیوسر، کسان مزدور وغیرہ وغیرہ۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ کچھ بھی بننے کا کوئی خاص خطرہ نہیں ہے اور ہم وہی رہیں گے جو کہ ہیں، اور وہ کیا ہے؟ خیر جو کچھ بھی ہے۔

تو تمہاری چھوٹی مٹلو اب اسٹار بن گئی ہے؟ جمخانہ کلب میں اس کا رقص کسی طور میرے تصور میں نہیں آتا، نہ جانے کیسی لگ رہی تھی، پبلک کے سامنے آنا بچّوں کے لئے اچھا ہے لیکن صرف ایک حد تک، اس میں زیادتی اعصاب پر بُرا اثر ڈالتی ہے، خیر تمہیں بہتر معلوم ہے لیکن تم کوئی ذمّہ داری سر نہ لو جو خواہ مخواہ دردِ سر ثابت ہو۔

۱۲۴

۲۵ر نومبر ۱۹۵۴ء

یہ سُن کر افسوس ہوا کہ تمہارا سفر بہت بُرا گزرا اور تمہاری طبیعت اچھی نہیں ہے۔ مجھے اسی کا ڈر تھا اس لئے کہ اس شام میری طبیعت بھی مضمحل تھی اور مجھے تو کوئی سفر بھی درپیش نہیں تھا، میرے خیال میں آئندہ بہتر یہی ہے کہ روانگی سے پہلے ایک دو گھنٹے آرام کر لیا کرو خواہ اس کی خاطر ملاقات کے کچھ ضمنی لمحوں کی قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑے اُمید ہے اب تمہیں افاقہ ہوگا اور تم اپنے علاج وغیرہ میں غفلت نہیں کروگی۔

تو اب ہمیں پھر ایک نئی[1] لویلی حکومت عطا ہوئی اور پُرانا طائفہ غالباً ہمیشہ کے لئے رخصت ہوا۔ واہ جی واہ! افسوس کہ یہ تماشہ دیکھنے کو ہم وہاں موجود نہیں

---

[1] میزی۔

بہرحال اُمید رکھنی چاہیے کہ اس سے ملک کی بھلائی کی کوئی صورت نکلے گی، کم ازکم لوگوں کی کچھ آس تو بندھ جائے گی۔

یہ خط جلدی میں لکھ رہا ہوں تاکہ اس ڈاک سے چلا جائے۔ میں خوش اور تندرست ہوں، دن پھسلتے جا رہے ہیں اور گھر کا خیال، آرزو بھی اپنے ساتھ لاتا ہے اور اطمینانِ خاطر بھی۔

۱۲۴

۲۹ / نومبر ۱۹۵۴ء

اب کے تمہارے جانے کے بعد مجھے ڈر تھا کہ اُمید رہائی کے التوا نے[1] تمہیں بہت رنجیدہ نہ کیا ہو۔ لیکن تمہارے خط سے تشفّی ہو گئی، میں نے تو اس خبر کو قطعی قابلِ توجہ ہی نہیں جانا۔ ایوانِ اسیری میں شب و روز کے جو آسیب قطار اندر قطار کھڑے ہیں میں تو ان کی جانب کبھی دیکھتا بھی نہیں۔ میں تو ان سے پرے اس روشن منظر پر نگاہ جمائے رکھتا ہوں جہاں بچّے کھیل رہے ہیں۔ اور لوگ باگ محنت کر رہے ہیں۔ دکھ اُٹھا رہے ہیں اور پیار کر رہے ہیں۔ لیکن شاید یہ بھی پوری طرح صحیح نہیں۔ اب مجھے ان آسیبوں کی قطار سے ڈر نہیں لگتا، میں کبھی کبھی ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ لیتا ہوں۔ اور ان پر لعنت بھیجتا ہوں۔ لیکن سب دن ایسے بد وضع بھی نہیں ہوتے۔ بیچ میں ایسے دن بھی آتے ہیں جب تم سے اور بچوّں سے ملاقات ہو جاتی ہے یا کسی کتاب سے کوئی اچھوتا نگینہ برآمد ہوتا ہے یا کوئی اچھا خیال ذہن میں تشکیل پاتا ہے یا کوئی دن ویسے ہی خوبصورت ہوتا ہے اور کسی نغمے کی طرح کیف انگیز۔ ایسا ہی ایک دن گزشتہ ہفتے کی جمعرات کا دن تھا، سنہری، نیم خنک، نیم گرم دن۔ جب ہلکے رنگ کے آسمان کے نیچے ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی، ایسے سرور کی کیفیت تھی کہ تمہیں خط لکھنے کو جی چاہا لیکن پھر دل میں آس پاس کی سب چیزوں کی فہرست بننے لگی۔ (ہمارا دل ہے ہی بہت حسابی) پرندے اور

---

[1] ان دنوں عدالت کے فیصلے کے خلاف اپیل مسترد ہو گئی تھی۔

پودے اور روشنیاں اور سائے۔ لیکن یہ فہرست گنوانا تو مقصود نہ تھا اس لئے میں نے چھوڑ دیا اور خط لکھنے کے بجائے دن بھر کافکا Kafka کے عاشقانہ خطوط پڑھتا رہا۔ کوئی اجاڑ اور بے رونق دن ہوتا تو شاید انہیں پڑھنا اپنی برداشت سے باہر ہو جاتا۔ اچھا ہوا تم نے یہ کتاب بھیج دی۔ اس سے نہ صرف کافکا کی دوسری تصنیفات کو سمجھنے میں امداد ملتی ہے بلکہ نفسیاتی اُلجھنوں سے ایذا طلبی کا وہ شدید جذبہ بھی سمجھ میں آتا ہے جس نے بہت سے دوسرے درجے کے ادیب پیدا کئے ہیں۔ ان کا مرض تو وہی ہے جو کافکا کا تھا لیکن کافکا سا خلوص اور کمال ان کے حصے میں نہیں آیا۔

ہمارا باغ لہک رہا ہے۔ نسٹرشیم اور کوسموس کے کچھ کچھ پھول کھلنے لگے ہیں اور گل داؤدی اور گیندا پوری بہار پر ہیں۔ افسوس کہ منٹگمری میں پھولوں کی کوئی نمائش نہیں ہوئی ورنہ ہم ضرور ایک آدھ انعام جیت لیتے۔

۱۲۵

یکم دسمبر ۱۹۵۴ء

تمہارا اتوار کا لکھا ہوا خط اتوار ہی کو مل گیا جس سے غیر متوقع خوشی ہوئی۔ تمہارے پچھلے دو خطوط پڑھ کر زیادہ فرحت ہوئی کہ بچّوں نے خود اپنی خریداری کی، اپنی خریدی ہوئی چیزوں سے خوش ہوئے اور نئے جوتے بستر میں ساتھ لے کر سوئے۔ کیسی پیاری بات ہے۔ صرف اس لئے نہیں کہ وہ ہمارے بچّے ہیں اگرچہ یہ بھی کچھ کم اہم نہیں، بلکہ اس لئے کہ وہ بچّے ہیں اور جب ہنستے ہوئے بچّوں کا تصور کرو تو یوں لگتا ہے کہ ساری دنیا روشن ہو گئی ہے۔ بڑی عمر کے لوگوں کی خوشی یا ہنسی میں یہ بات نہیں ہوتی اس لئے کہ اوّل تو ان میں بچّوں کا خلوص اور بے فکری نہیں ہوتی اور دوسری بڑی عمر کے لوگ الگ الگ افراد ہوتے ہیں۔ لیکن بچّے تو پھولوں یا پرندوں کی طرح فطرت کا جزو ہوتے ہیں، چنانچہ ان کی خوشی یا ناخوشی یہی تاثر پیدا کرتی ہے کہ ساری دنیا ہنس رہی ہے یا آنسو بہا رہی ہے۔ یہ خیال کافی دور تک پہنچ سکتا ہے۔ لیکن رہنے دو، بس اتنا ہے کہ انہیں جس قدر خوشی بہم پہنچا سکتے ہیں پہنچائیں اور یہ اُمید رکھیں کہ جب یہ بڑے ہوں گے تو ان کی دنیا

ہماری دنیا سے بہتر ہوگی اور ان کے ستارے ہمارے ستاروں سے زیادہ مہربان ہوں گے۔ اگرچہ ہمارے بھی کچھ ایسے نامہربان نہیں تھے۔

صبح نو بجے سے ذرا اوپر وقت ہے، دھوپ کھلی ہوئی ہے اور ہوا میں حرارت ہے۔ میں ناشتے کے بعد سے برآمدے میں بیٹھا دو طوطوں اور ایک گلہری کا تماشا دیکھ رہا ہوں، صبح سے یہ گلہری برآمدے کی چھت پر باہر دھوپ والی طرف کود پھاند رہی ہے اور دوسری جانب طوطوں کا ایک جوڑا ٹھونگیں مار مار کر اُسے بھگانے کی کوشش کر رہا ہے گلہری ذرا بھی نوٹس نہیں لیتی اور بدستور اپنی چہل بازی میں مصروف ہے۔ کبھی کبھی ذرا اکڑ کر اپنے حریف کو گھور بھی لیتی ہے۔ دونوں فریق اتنے ڈرپوک ہیں کہ کھل کر سامنا کرنے سے کترا رہے ہیں۔ صرف گیدڑ بھبکیوں پر زور ہے۔ اگلے دن میں یہیں بیٹھا تھا کہ یکایک میرے پیچھے بہت زور کا شور بلند ہوا، مڑ کر دیکھا تو کوؤں، طوطوں اور شارکوں کا ایک متحدہ محاذ بیک آواز آسمان سر پر اٹھائے تھا، نیچے نظر پڑی تو دیکھا کہ ایک بلّی بہت کھسیانے انداز میں جھاڑیوں کی طرف کھسک رہی ہے مجھے یکایک خیال آیا اسے کہتے ہیں "رائے عامہ کی طاقت"۔ تو جیل خانے میں ہمارا سینما اور تھیٹر اور کھیل تماشہ بس یہی کچھ ہے، جو کچھ نہ ہونے سے بہر حال بہتر ہے۔ پھر پھول بھی ہیں، کتابیں بھی خیال بھی اور یادیں بھی، اور وقت کبھی تھمتا نہیں ہے اور ایک سال قریب بیت چکا ہے۔

۱۲۶

۳۱ دسمبر ۱۹۵۴ء

نئے سال کی شام۔

ابھی شام نہیں ہوئی ہے، صرف نصف صبح گزری ہے۔ چند گھنٹے اور باقی ہیں اور پھر یہ برس بھی ہمارے گرد آلود دیمردزمیں مل کر خاک ہو جائے گا۔ شاید اسی وجہ سے اس دن کے لئے کوئی جذبہ دل میں محسوس نہیں ہوتا، نہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ جادۂ وقت میں یہ دن کوئی اہم سنگِ میل ہے، یہ دن ویسا ہی ہے جیسے جیل خانے

کے باقی دن ہیں جس سے صرف اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ پیمانۂ عمر میں بے رونقی کی مے ایک درجہ اور نیچے اُتر آتی ہے۔ جب سائے ڈھلنے لگیں گے تو شاید یہ تاثر بدل جائے اور اس دن کی کچھ اس طرح شناخت ہو سکے کہ یہ آخری درد کے آخری سال کا آخری دن ہے (آخری درد اس لئے کہ ہر خوشی کی طرح ہر درد بھی اپنی جگہ آخری ہوتا ہے جو گزر جائے تو کبھی پلٹ کر نہیں آتا۔ پھر یہ درد صرف یاد میں واپس آ سکتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر درد کی یاد سے کچھ محسوس ہو جیسے یہ ضروری نہیں کہ جو بھی خوشی یاد کی جائے اس سے راحت پہنچے۔) اور پھر دل اس یقین سے خورسند ہوگا کہ کل بیدار ہوں گے تو ایک نئے سال کا نیا دن طلوع ہو چکا ہوگا۔ جس سال کے دوران میں اُمید ہے کہ زندگی کی جدوجہد کی جانب اور دل و دماغ کسی بامقصد عمل کی طرف رجوع کر سکیں گے۔

تو آؤ دعا کریں کہ یہ نیا سال اور اس کے بعد آنے والا ہر سال ہمارے لئے ہمارے بچّوں کے لئے اور ساری انسانیت کے لئے امن و مسرّت کا پیغام لائے اور عہد ماضی کا بھی شکر ادا کریں۔ ان سب نعمتوں کے لئے جو ہمارے حصّے میں آئیں اور جو کچھ چھن گیا یا جس سے محروم رہے اس سے درگزر کریں اس لئے کہ یہ درد و محرومی برداشت کرنے کی سکت بھی ہمیں میسّر تھی۔

کیا میں کسی پادری صاحب کی سی گفتگو کر رہا ہوں؟ لیکن اس دن کچھ دیندار اور کچھ جذباتی محسوس کرنا تو قدرتی بات ہے۔

کتابوں کے بارے میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ جو کتاب آسانی سے دستیاب نہ ہو سکے یا بہت قیمتی ہو اس کے لئے تردّد کی ضرورت نہیں ہیں تو یونہی بے قاعدگی سے پڑھتا رہتا ہوں اور جو کتاب بھی ہاتھ آ جائے غنیمت معلوم ہوتی ہے۔ دراصل بیکار لوگوں کا دماغ تو کچھ الٹھ چھوکری کا سا ہو گیا ہے جس میں طرح طرح کے لالچ لپکے بھرے رہتے ہیں اور ہر چیز جو ہاتھ آ سکے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسے زیادہ بگاڑنا نہیں چاہئے۔ آسکر وائیلڈ کی کتاب کا وہی نام ہے جو تم نے لکھا یعنی House of prome-granates۔ لندن یونیورسٹی کا کوئی پرانا کیلنڈر مل سکے تو

اس سے بھی کام چل جائے گا اور عربی لغت کی کچھ ایسی جلدی نہیں۔

۱۲۷

۷ر جنوری ۱۹۵۵ء

کل صبح جب میں اپنی سالگرہ[1] کے دن بیدار ہوا تو میرا خیال تھا کہ یہ بے رنگ ابر آلود دن بھی ایسے ہی کسی ہنگامے یا قابلِ ذکر بات کے بغیر گزر جائے گا۔

لیکن یہ خیال بالکل غلط ثابت ہوا۔ بسم اللہ یوں ہوئی کہ ابھی میں بستر ہی میں تھا کہ اسحاق نے بہت سے گلاب کے پھول لا کر ڈھیر کر دیئے۔ بستر سے اٹھ کر باہر نکلا تو دیکھا کہ سورج چمک رہا ہے اور آسمان پر بادل کا نام و نشان تک نہیں۔ پھر ہم ناشتے پر بیٹھے تو تمہارا تار آ گیا۔ گیارہ بجے کے قریب کافی کے لئے صحن میں گئے تو تمہارا تحفہ موصول ہوا (لیکن ہم اسے کریں گے کیا؟ ایسے خوبصورت کاغذ پر کچھ لکھنا تو ظلم ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ اسے دیکھ کر عروسِ سخن جو بہت دن سے غائب ہے لوٹ آئے) کوئی ایک گھنٹے کے بعد دفتر سے پیغام آیا کہ کچھ کھانے کی چیزیں آئی ہیں۔ دیکھا تو ایک پوری فوج کا پیٹ بھرنے کو کافی تھا۔ جیل میں ایک خرابی یہ ہے کہ نہ کوئی ضیافت کر سکتے ہیں نہ مہمان بلا سکتے ہیں اور ہم تین نفر اس دسترخوانِ نعمت سے کیسے نپٹ سکتے تھے۔ خیر جتنا کھا سکے کھایا۔ میرے دونوں ساتھیوں کا شکریہ قبول کرو۔ خوب سیر ہو کر ہم دھوپ میں گھاس پر لیٹ گئے کہ اب کچھ ہونے کا نہیں۔ اتنے میں چمپا کا بہت دوستانہ تار آ گیا۔ اسے میرا پیار پہنچا دینا۔ ہم تو خود لکھ نہیں سکتے۔ غرض کہ بہت بھرپور اور مسرّت بھرا دن تھا جس میں کبھی کبھی یاد اور اُداسی کا سایہ بھی دل پر پڑتا رہا ہے لیکن بس یوں ہی تھوڑی دیر کے لئے۔

---

[1] میٹرک کے سرٹیفکٹ میں تاریخ پیدائش ۷ر جنوری ۱۹۱۱ء لکھی ہے اور جب تک صحیح تاریخ کا علم نہیں ہوا تھا اس وقت تک فیض کی سالگرہ ۷ر جنوری ہی کو منائی جاتی تھی۔ بعد میں تحقیق سے پتہ چلا کہ صحیح تاریخ ۱۳ر فروری ۱۹۱۱ء ہے۔

میں آج کل گدگل کے افسانوں سے دل بہلا رہا ہوں۔ پرانے زمانے کے عربوں سے بھی تجدید ملاقات ہو گئی ہے اور اس میں کافی لطف آرہا ہے مثلاً یہ قصہ سنو۔

ایک بار اُموی سپہ سالار مہلّب نے خارجی باغیوں کے خلاف لشکر کشی کی۔ اُن دنوں عرب میں دو شاعروں کا چرچا تھا اور اُن کی ہجویں اور قصیدے زبان زدِ خاص و عام تھے۔ ایک کا نام جریر تھا۔ دوسرے کا فرزدق۔ دونوں میں سخت رقابت تھی اور دونوں کے بہت سے طرفدار تھے ایک شام مہلّب نے دیکھا کہ اس کی چھاؤنی میں بہت شور شرابہ ہو رہا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ فوج میں بغاوت ہونے والی ہے۔ پتہ یہ چلا کہ ان دو شعراء کے دو قصائد پر بحث ہو رہی ہے۔ فریقین نے مہلّب سے کہا کہ آپ فیصلہ دیجئے کہ ان میں بہتر کون ہے اور ہمیں آپ کا کہا تسلیم۔ مہلّب بولے میں اِن دو کتّوں کے بارے میں ہرگز کوئی فیصلہ نہیں دوں گا۔ جس کے خلاف فیصلہ ہو گا وہ اپنی ہجووں میں مجھے نوچ کر کھا جائے گا۔ یہ بات تم اُن جنونی لوگوں سے پوچھو جن سے تم لڑنے جا رہے ہو۔ کیونکہ ان کو دونوں کی کچھ پرواہ نہیں ہے۔ خیر صبح ہوئی اور دونوں فوجیں آمنے سامنے آئیں۔ اُموی فوج سے ایک بہادر نکلا جیسا کہ دستور تھا اس نے صفِ اعداء میں سے کسی کو مقابلے کے لئے للکارا۔ اُدھر سے ایک خارجی جوان نکلا۔ اُموی نے کہا۔ دیکھو ہمیں لڑنا تو بہرحال ہے لیکن لڑائی سے پہلے میرے ایک سوال کا جواب دو۔ خارجی نے کہا سوال کرو لیکن شتابی کرو۔ اموی نے کہا اچھا تو بتاؤ اِن دو قصائد میں سے کون سا بہتر ہے۔ خارجی بولا لعنت ہے تمہاری صورت پر۔ تم لڑنے آئے ہو یا مشاعرہ کرنے؟ ہم لوگ صرف قرآن اور احکامِ رسول جانتے ہیں۔ ہمیں ان جہنّمی قصیدوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن پہلا عرب ضد کرتا رہا کہ بھئی بتا دو نا۔ آخر خارجی نے کہا اچھا تو پھر میری رائے میں جریر کا قصیدہ بہتر ہے۔ اُموی سپاہی بھی اتفاق سے جریر کا طرفدار تھا۔ اس جواب سے بہت خوش ہوا اور کہنے لگا۔ بھئی ذرا دم لو، میں اپنے ساتھیوں کو بتا آؤں۔ اگر میں مارا گیا تو انہیں کیسے پتہ چلے گا۔ یہ کہہ کر وہ اپنے لشکر کی طرف بھاگا اور انہیں خارجی کا فیصلہ سُنایا اور واپس آکر لڑنے لگا۔

اچھی کہانی ہے کہ نہیں ؟

۱۲۸

۲۷ رجنوری ۱۹۵۵ء

غالباً لاہور شہر آج کل کرکٹ[1] کے بخار میں مبتلا ہوگا۔ یہ (Displacement) کی بہت اچھی مثال ہے۔ اس سے مراد ہے دبی ہوئی اور ناآسودہ خواہشات کی تسکین کے لئے کسی بالکل مختلف دائرہ عمل میں سرگرم ہونا جس کا ان خواہشات سے کوئی علاقہ نہ ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی قومی مسئلہ۔ سنسر نے کاٹ دیا۔ ایسا نہیں جیسے کسی غریب — سنسر نے کاٹ دیا — کلرک نے وہ اہمیت دی ہو جو آج کل کرکٹ کو حاصل ہے۔ گویا اس نے کرکٹ کے میدان کو زندگی کے میدان کا بدل بنا لیا ہے۔ اس لئے کہ زندگی کے محنت طلب میدان میں اس کے لئے کیف و ولولے کا کوئی سامان موجود نہیں لیکن کرکٹ میچ کے ہر سنسنی خیز مرحلے میں وہ کلرک برابر کا شریک ہو سکتا ہے۔ خیر اگر بے چارہ کو اسی میں مزہ ملتا ہے تو ہم حرف گیری کیوں کریں۔ لیکن مجھے یہ رویہ کچھ غیر صحت مند اور قابلِ افسوس نظر آتا ہے۔ شاید بڑھاپے کا اثر ہے۔

منٹو کی وفات کا سنکر بہت دُکھ ہوا۔ سب کمزوریوں کے باوجود مجھے نہایت عزیز تھے اور اس بات پر مجھے کچھ فخر بھی ہے کہ وہ امرتسر میں میرے شاگرد تھے۔ اگرچہ یہ شاگردی کچھ برائے نام ہی تھی۔ اس لئے کہ وہ کلاس میں تو شاید ہی کبھی آتے ہوں۔ البتہ میرے گھر پر اکثر صحبت رہتی تھی۔ اور چیخوف فرائڈ اور موپساں اور نہ جانے کس کس موضوع پر گرم مباحثے ہوتے تھے۔ بیس برس گذر چکے لیکن یوں لگتا ہے جیسے کل کی بات ہے ہمارے شرفاء جنہیں دورِ حاضر کے فنکار کی شکستِ دل کا نہ احساس ہے نہ اس سے کوئی ہمدردی۔ غالباً یہی کہیں گے کہ منٹو مر گیا تو اس کا اپنا قصور ہے۔ بہت پیتا تھا۔ بہت بے قاعدہ زندگی بسر کرتا تھا۔ صحت کا ستیاناس کر لیا تھا وغیرہ وغیرہ لیکن یہ کوئی نہیں سوچے گا کہ اس نے ایسا کیوں کیا تھا؟ ایسے ہی کیٹس نے بھی اپنے کو مار رکھا تھا۔

---

[1] ان دنوں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کرکٹ کے ٹیسٹ میچ ہو رہے تھے۔

برنر نے بھی۔ موزارٹ نے بھی اور بھی کئی نام گنوائے جا سکتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ جب معاشرتی حالات کی وجہ سے فن اور زندگی ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہوں تو دونوں میں سے ایک کی قربانی دینی ہی پڑتی ہے۔ دوسری صورت سمجھوتہ بازی کی ہے جس میں دونوں کا کچھ حصّہ قربان کرنا پڑتا ہے اور تیسری صورت ان دونوں کو یکجا کر کے جدوجہد کا مضمون پیدا کرنے کی ہے جو صرف عظیم فنکاروں کا حصّہ ہے۔ منٹو عظیم نہیں تھا لیکن بہت دیانتدار بہت ہنرمند اور قطعی راست گو ضرور تھا۔ میرے خیال میں اس کا گھر تمہارے راستے ہی میں ہے۔ گزرتے ہوئے وہاں سے ہو آنا اور میری طرف سے بہت پیار اور دلی تعزیت پہنچا دینا۔

۱۲۹

۲۲ فروری ۱۹۵۵ء

میں تمہیں پرسوں بھی لکھنا چاہتا تھا اور کل بھی۔ اس لئے کہ آج کل صبحیں حسین ہیں۔ ارغوانی گھٹائیں چھائی رہتی ہیں جیسے کسی سوچ میں غرق ہوں، ہوا کسی گم گشتہ راہ کی طرح ہولے ہولے پیڑوں کے ارد گرد گھومتی رہتی ہے اور صبح کے سُست رو سورج کے ساتھ ساتھ سبزے پر سائے دھوپ چھاؤں کا کھیل کھیلتے رہتے ہیں —— یہ دن Dandelion days[1] پڑھنے کے لئے بہت ہی موزوں دن تھے اور یہ کتاب میں نے قریب قریب ایک ہی نشست میں ختم کر ڈالی۔ بہت لطف آیا، صرف اس کتاب کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے دور دراز بچپن کے محسوسات کے تصوّر سے بھی گنّے کے کھیتوں کی نشیلی باس، لیموں اور سنگترے کے نوشگفتہ پھولوں کی یاد اور خوشبو، املتاس کے پیڑوں پر جھومتے ہوئے طلائی جھوم Van gogh[2] کی تصاویر کے ہمرنگ گندم اور سرسوں کے کھیت اور بارش کے بعد دھوپ کی حنائی رنگت، شیشم کے درختوں تلے گرم ہوا میں ٹھنڈک کی لہر، بدن کے نیچے نرم گھاس کا لمس، وہ ولولہ جو ریلوے انجن کی سیٹی اور چھک چھک سے یا پانی میں کاغذ کی کشتیاں بہانے سے ہمیشہ دل میں اٹھتا تھا، ایسے

دن جن میں خوشی سے سانس رکنے لگتا تھا۔ ایسے دن بھی جو کبھی خوف اور ڈر سے سیاہ رنگ نظر آتے تھے۔ اور کبھی درد اور بیماری سے تلوار کی طرح کٹیلے' جب میں یہ کتاب پڑھ رہا تھا تو ذہن میں یہ دوسری کتاب بھی لکھتا جا رہا تھا' لیکن میری کتاب غالباً کبھی لکھی جائے گی۔ یا شاید لکھی بھی نہ جائے۔

نقوش کا شخصیات نمبر مل گیا ہے' تمہارا خاکہ بھی پڑھ لیا ہے' بہت اچھا ہے' اگرچہ میں سمجھتا ہوں کہ تم نے اپنے میاں کی کچھ طرفداری کی ہے' باقی لوگوں نے بھی ایسا ہی کیا ہے' اگرچہ ان مرقعوں سے اندازہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے سبھی ادیب فرشتے اور ولی اللہ ہیں۔ سوائے بیچارے منٹو کے جس کا اس کے بھانجے حامد جلال نے شاید کچھ زیادہ سختی سے محاسبہ کیا ہے' اب خیال آتا ہے کہ اس شمارے کے لئے مجھے بھی کچھ لکھنا چاہیے تھا۔ اس لئے کہ کچھ شخصیتیں ایسی بھی ہیں جو بڑے ادیب نہ سہی لیکن جن کا حلقہ اثر بہت وسیع تھا۔ جیسے رشید جہاں تھیں اور کچھ ایسے تھے جن کی صحیح اہمیت کا لوگوں کو اندازہ نہیں جیسے تاثیر تھے۔ خیر کچھ مضائقہ نہیں پھر کبھی سہی۔

۱۲۰

۶ مارچ ۱۹۵۵ء

ایک مہینہ اور گزر گیا اور تھوڑے دنوں میں ایک اور گزرنے پر آجائے گا آج کل کچھ احساس نہیں ہوتا کہ وقت جلدی گزر رہا ہے یا آہستہ گزر رہا ہے' یوں لگتا ہے کہ وقت کا وجود ہی باقی نہیں۔ ایسے ہے کہ جیسے ایک ہی دن اور ایک ہی رات بار بار گردش کر رہے ہیں' وہی دن جہاں ختم ہوتا ہے وہاں سے وہی رات شروع ہو جاتی ہے اور رات کے خاتمے پر وہی دن پھر لوٹ آتا ہے۔ گویا فرداودی کا تفرقہ ہی باقی نہیں رہا' لیکن ہر چیز کو حقیقت تو وقت ہی بخشتا ہے اور جب وقت غیر حقیقی ہو جائے تو ہر چیز بے حقیقت ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اپنے دل کا درد بھی' اس سے کبھی تسکین ملتی ہے اور کبھی بوریت ہوتی ہے۔ ویسے ذہن میں ہر وقت یہ احساس ضرور رہتا ہے کہ یہ غیر حقیقی کیفیت بھی غیر حقیقی ہے اور وقت بظاہر جمود کے باوجود بہرحال

گزر رہا ہے اور زندگی کی اچھی چیزیں مسلسل قریب آتی جا رہی ہیں، اس خیال کا سلسلہ شاید ابھی اور آگے چلتا لیکن ہماری دوست گلہری نے بیچ میں ٹوک دیا جو مجھ سے دو قدم پر پھول دار پودے سے کُشتی لڑ رہی ہے۔

اس نے پچھلے پنجوں پر کھڑے ہو کر اپنے سر کے برابر ایک پھلی نوچ گرالی اور اپنے سے تین گنا اونچی شاخیں جھکانے کی کوشش کر رہی ہے تاکہ باقی خزانہ بھی ہاتھ آ جائے اگر ہم میں شہریت کی حس زیادہ ہوتی تو شاید یوں بیٹھ کر دیکھتے رہنے کے بجائے ہم اسے بھگا دیتے، آخر یہ باغیچہ پبلک کی ملکیت ہے۔ اور ہیڈ[1] مالی کی اجازت کے بغیر پھول توڑنا سخت منع ہے۔ پھر جیل میں پودوں کو نقصان پہنچانا جرم جس کی ضابطہ نمبر فلاں فلاں کے تحت مجھے فوراً رپورٹ کرنی چاہئے۔ لیکن کچھ کرنے کے بجائے میں صرف اس کے بارے میں لکھ رہا ہوں اور یہ ٹھیک بھی ہے، ہمارے عالم فاضل لوگ کہتے ہیں کہ ادیب کا کام صرف لکھنا ہے، ایسے عملی معاملات میں دخل نہیں دینا چاہئے، البتہ جب ہیڈ مالی آکر اس پودے کا حال دیکھیں گے تو یقیناً ہمارے فلسفہ پر بہت برہم ہوں گے

۱۳۱

۱۷ مارچ ۱۹۵۵ء

یہ خط پہلے لکھنا چاہئے تھا لیکن موسم ایسا اچھا تھا کہ کاہلی طاری رہی اور خط لکھنے کے بجائے ہم رادھاکرشنن[2] کی ہندو دیویوں اور دیوتاؤں سے اختلاط کرتے رہے۔ موصوف نے بہت تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ انسان نے اپنی فطرت کے مطابق دیوتا کیسے ایجاد کئے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ان ہی دیوتاؤں کے وہ خود بھی قائل ہیں۔ استدلال ان کا یہ ہے کہ چونکہ مذہب کا وجود لازمی ہے اس لئے کوئی نہ کوئی

---

[1] سابق میجر اسحاق

[2] سابق صدر ہند اور کتاب ہندو فلسفے کے مصنّف۔

ایسی ہستی بھی لازم ہے جس کی پرستش کی جا سکے، اس لئے کسی کو کوئی نہ کوئی ذاتی معبود ضرور چاہئے، خواہ عقل اور فلسفہ کچھ ہی کہیں۔ غالباً جس چیز کو بھی ہم عزیز رکھتے ہیں یا جس کی طلب ہوتی ہے (جیسے مجھے سگریٹ کی ہے) اس کے لئے ہم ایسے ہی جواز پیدا کر لیتے ہیں۔

افتی سے بہت مختصر ملاقات ہوئی اور زیادہ بات نہ ہو سکی۔ مجھے بالکل یاد ہی نہیں رہا کہ وہ دو برس سے مجھ سے ملنے نہیں آئے اس لئے کچھ گلہ و شکوہ کرنا چاہئے تھا۔ اب وہ اگلے مہینے آنے کا وعدہ کر گئے ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اب جیل خانے سے باہر ہی ملاقات ہوگی دراصل اس کا مجھے کوئی گلہ بھی نہیں ہے جو کسی سے بن پڑے بہت ہے۔

۱۳۲

۲۶ / مارچ ۱۹۵۵ء

مجھے افسوس ہے کہ کل ہم خدا حافظ نہ کہہ سکے مجھے اُمید ہے کہ تم اس نئے قضیئے[1] کا اپنے دل پر بہت زیادہ اثر نہیں لوگی۔ قانون جو بھی حق دیتا ہے اسی پر بہر صورت اصرار کرنا چاہئے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس نئی صورت حال سے کچھ ایسا فرق بھی نہیں پڑے گا، اس لئے میں تو مطمئن ہوں البتہ تمہارے بارے میں کچھ پریشانی ضرور ہے، کرس کی علالت کے بارے میں بھی تشویش ہے اس لئے مجھے اپنی اور ان کی خیریت سے بذریعہ تار مطلع کر دینا۔ (خط تاخیر سے ملے گا)

اب ہماری ملاقات ہر دوسرے ہفتے جمعرات کے دن ہو سکے گی اور اس کے لئے ڈی آئی جی، سی آئی ڈی کی اجازت درکار ہوگی، گزشتہ بار ہماری

---

[1] ۲۵ / مارچ ۱۹۵۵ء کو لاہور ہائی کورٹ نے فیض کو ضمانت پر رہا کرنے کا حکم دیا تھا جو ایلس اپنے ساتھ لے کر لاہور سے منٹگمری پہنچیں لیکن فیض کو جیل خانے کے اندر ہی سیفٹی ایکٹ کے تحت دوبارہ گرفتار کر کے نظر بند کر دیا گیا۔ چنانچہ خط ۱۳۲ تا ۱۳۵ سیفٹی ایکٹ کے اسیر کی حیثیت میں لکھے گئے۔

ملاقات نہ ہونے کے برابر تھی اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم جلد سے جلد یہاں آؤ۔ ۷ / اپریل کو سہی۔

۱۳۳

۳۰ / مارچ ۱۹۵۵ء

آج پیر ہے۔ دو دن پہلے جو خط لکھا تھا نہ جانے تم تک پہنچا کہ نہیں۔ کاش میں تمہاری پریشانی کا بوجھ کم کرنے کے لئے کچھ کر سکتا لیکن سوائے پیار بھیجنے کے اور کچھ کر ہی نہیں سکتا اور پیار میں شب و روز ارسال کرتا ہوں اس دعا کے ساتھ کہ انصاف اور نیکی دنیا میں پلٹ آئیں اور دکھی دلوں کی دلجوئی کا سامان بہم پہنچائیں۔ جب تک صبر کرو مری جان اور زیادہ پریشان نہ ہو۔ میں جانتا ہوں کہ یہ کہنا آسان ہے اور کرنا مشکل لیکن تمہارے وکلا بہت اچھے ہیں اور جو وہ مشورہ دیں اس پر عمل کرو۔ میں اس بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ غالباً جب ہماری ضمانت منسوخ ہو جائے گی تو ہم پھر سزا یافتہ ملزم بن جائیں گے اور ہمارے وکلا جب چاہیں ہمیں نظر بندی کے منصب اعلیٰ سے (اس کے تکلیف دہ قواعد و ضوابط سمیت) چھٹکارا دلا سکتے ہیں۔ اس لئے ہماری صورتِ احوال نہ پہلے سے اچھی ہے نہ بُری۔ تم مسکراتی رہو۔ میں خوش و خرم ہوں۔

۱۳۴

۳ / اپریل ۱۹۵۵ء

تمہارا خط اور تار پہنچے اس لئے دل پہلے سے بشاش ہے۔ شاید اسی رعایت سے موسم بھی بہتر ہو گیا ہے اور گزشتہ چند دن کافی خوشگوار گزرے۔ البتہ اس قانونی قضئے کی وجہ سے جیل کی زندگی کا خاموش توازن کچھ گڑبڑ ہو گیا۔ امید ہے کہ یہ قصہ جلد نبٹ جائے گا۔ اب جو یہ ہنگامہ گزر چکا ہے تو یوں لگتا ہے کہ یہ بھی جیل کے معمولات ہی کا حصہ تھا۔ کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ یہ سن کر خوشی ہوئی کہ کرس کی علالت تشویشناک نہیں ہے۔ اگرچہ ان سے ملاقات نہ کر سکنے کا افسوس ہے۔ یہ بھی افسوس ہے کہ یہ سب گڑبڑ بچوں کے امتحانات کے دوران میں ہوئی۔ امید ہے کہ وہ زیادہ پریشان

نہ ہوئے ہوں گے۔

سنا ہے حفیظ جالندھری صاحب نے پھر شادی رچالی ہے۔ سینیر کا قصہ بیچ میں نہ ہوتا تو انہیں ضرور مناسب سہرا لکھ بھیجتا لیکن اب تو اپنے تک ہی رکھنا پڑے گا۔

۱۳۵

۹ اپریل ۱۹۵۵ء

اُمید ہے تم خیریت سے گھر پہنچ چکی ہو گی۔ ملاقات غنیمت تھی لیکن تمہیں اس قدر دل برداشتہ دیکھ کر رنج ہوا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ نئی دل شکنی بہت تکلیف دہ تھی لیکن بہتری کی اُمید رکھنے کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔ ہمارے لئے تو یہ اختیاری بات نہیں امرِ مجبوری ہے۔ اگرچہ ہماری عمر کے چند بیش قیمت سال برباد ہو گئے لیکن زندگی میں پھر بھی بہت دیکھنے کو باقی ہے۔ یہ بہت عام سی بات ہے اور میں کئی بار دُہرا بھی چکا ہوں لیکن اس کے باوجود صحیح ہے اور جب تک زندگی باقی ہے صحیح رہے گی اور ہماری زندگی کے خاتمے پر اوروں کے لئے ویسی ہی سچ ہو گی۔ تو آؤ دل کو سنبھالیں اور اگلی فصلِ گل کا اس وقت تک انتظار کریں جب کہ ہجومِ گل پر سے خزاں کا سایہ اُٹھ چکا ہو گا۔ اب رہائی کے دلوں کا شمار ختم ہو چکا تو دل ایک بار پھر ٹھہر گیا ہے البتہ ذہن کسی مشقت پر آمادہ نہیں ہوتا اس لئے میں نے تاریخ اور فلسفے کی کتابیں طاق پر رکھ دیں ہیں اور آج کل محض خرافات سے دل بہلا رہا ہوں۔ یہ تفریح تو اچھی ہے لیکن کبھی کبھی دل ملامت کرنے لگتا ہے اگر ڈرائینگ اور ڈیزائن کے اصولوں پر کوئی ابتدائی کتاب مل سکے (جیسی میٹرک کے طلبہ استعمال کرتے ہیں) تو بھجوا دو۔

چھمی اور میزبی کے نام خطوط

(خط ۱) تمہارے بہت اچھے خطوں کا بہت شکریہ۔ اِن سے ہمیں بہت خوشی ہوئی۔ امّی کہتی ہیں کہ وہ تمہیں ایبٹ آباد بھیجنا چاہتی ہیں۔ اگر لاہور میں بہت گرمی ہے تو اچھا ہے کہ تم چلی جاؤ۔ یہاں گرمی زیادہ نہیں ہے ہر وقت ہوا چلتی ہے اور ہر روز کھانے کو آم ملتے ہیں۔ بہت سا پیار۔

(خط ۲) ہم راضی خوشی ہیں۔ امّی نے لکھا ہے کہ تم دونوں بہت اچھی بچیاں ہو۔ یہ سُن کر بہت خوشی ہوئی۔ یہاں ہمارے بہت سے دوست ہیں اور سب بہت خوش رہتے ہیں۔ جب گھر آئیں گے تو تم سے مل کر خوب مزے کریں گے۔ امید ہے کہ ہم جلد آجائیں گے۔ تم اپنی امی کا ہاتھ بٹاتی رہو اور زیادہ شرارت نہ کرو۔

(خط ۳) تمہارے پیارے خط کا بہت شکریہ۔ مجھے بہت خوشی ہے کہ اب تمہاری امّی اور میرے پاس ایک بیٹی کے ساتھ ایک بیٹا بھی ہے۔ بیٹوں کو بہت بہادر اور بہت اچھا ہونا چاہیے۔ اس لئے کہ انہیں اپنی ماں اور بہنوں کی دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم بہت اچھے اور بہادر ہوگے۔ میرا کرسمس کا تحفہ بہت اچھا تھا سب لوگوں نے پسند کیا۔ کل ہمارے ہاں کرسمس پارٹی ہوگی پھر ایک مشاعرہ بھی ہوگا۔ بہت سا پیار۔

(خط ۴) تمہارا بہت اچھا خط ملا۔ آج کل تمہیں چھٹی ہوگی ہمیں بھی چھٹی ہے۔ تھوڑے دنوں میں امّی آئیں گی تم بھی آؤگی پھر ہم خوب باتیں کریں گے۔ امّی تمہیں کراچی بھی لے جائیں گی، وہاں سمندر بھی ہے جہاز بھی ہیں اور چڑیا گھر بھی ہے، میں نے سنا ہے وہاں کے چڑیا گھر میں مگرمچھ بھی ہوتے ہیں۔ ہماری بلّی اور اس کا بچہ بھاگ گئے تھے۔ بلّی آگئی ہے لیکن بچہ نہیں آیا۔ شاید وہ بھی آجائے۔

ہم شام کو خوب کھیلتے ہیں، کبھی کبھی باہر سے آئس کریم بھی آتی ہے۔ جب تم آؤگی تو تمہیں بھی کھلائیں گے، بہت پیار۔

(خط ۵) امّی تمہارے خط لائی تھیں۔ بہت اچھے خط تھے۔ امّی اب گھر پہنچ گئی ہونگی امّی پھر آئیں گی تو شاید تم کو بھی لے آئیں۔ اگلے مہینے میں گرمی کم ہو جائے گی تو تم آسکو گی۔ تمہارے اسکول میں چھٹی بھی ہو جائے گی۔ ہم تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ بہت سا پیار۔

(خط ۶) تمہیں سالگرہ مبارک ہو۔ امید ہے کہ سالگرہ کی دعوت اچھی ہوئی ہوگی تم نے بہت اچھا خط لکھا تھا۔ جس سے مجھے بہت خوشی ہوئی۔

(خط ۷) تمہارا بہت پیارا خط ملا۔ تمہاری تصویریں بھی ملیں۔ تم دونوں کتنی بڑی ہو گئی ہو۔ خیر یہاں آؤ گی تو دیکھیں گے۔ ہم تمہیں عید کے دن بہت اچھا کھانا کھلائیں گے۔ اور بھی بچے آئیں گے۔ شاید ہم تمہیں گانا بھی سنائیں گے۔ ہنسی کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہملوگ بہت اچھی قوالی کرتے ہیں۔ تمہارا لطیفہ بہت اچھا تھا، تمہارے امتحان کا نتیجہ سُن کر خوشی ہوئی، حساب میں کم نمبر آئے ہیں تو کوئی بات نہیں۔ حساب تمہارے ابا کو بھی نہیں آتا تھا۔ یہاں موسم اچھا ہے اور گرمی بہت کم ہے۔ رات کو کافی ٹھنڈک ہوتی ہے اور دن کو بھی بہت ٹھنڈی ہوا چلتی ہے۔

یہاں سب لوگ اچھی طرح ہیں اور تم دونوں کو پیار بھیجتے ہیں۔

(خط ۸) تمہارے محبت بھرے خط کا شکریہ۔ اِس سے مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اب تم بہت اچھی طرح لکھتی ہو۔ اُردو میں خط لکھنا بھی تمہیں سیکھ لینا چاہئے۔

آج کل یہاں بہت گرمی ہے۔ ہمارے باغیچے کے پھول ختم ہو گئے ہیں دوسروں کے پاس تو ایک آدھ بھی البتہ ہمارے پاس چند ایک پھول ابھی موجود ہیں۔ کچھ تو سفید پٹونیاں ہیں۔ کئی رنگوں کے کچھ زینیا ہیں۔ سُورج مُکھی کے پھول بھی نکلنے لگے ہیں۔ سویٹ ولیم اور ہالی ہاک کے چند ایک درختوں میں بھی پھول کھلتے ہیں۔ بس چند روز بعد بارشیں شروع ہو جائیں گی۔ تب ہمارا باغیچہ پھر خوبصورت ہو جائے گا۔ تم جانتی ہو کہ جب گرمی بہت زیادہ ہوتی ہے تو لوگ باہر نہیں نکلتے اور اس وجہ سے پھولوں کو نہیں دیکھتے۔ اور یہ پھول (ان سے خفا ہو کر) چلے جاتے ہیں۔ جب کچھ ٹھنڈک ہو جاتی ہے اور لوگ باگ چلتے پھرتے رہتے ہیں تو پھول بھی نکل آتے ہیں (انہیں خوش کرنے کے لئے)۔

امید ہے کہ تمہاری دعوتیں مزیدار رہوئی ہوں گی۔ ہمارے ہاں کوئی دعوت نہیں ہو رہی ہے کیونکہ سب روزے رکھتے ہیں۔ بتاؤ تمہیں کیا تحفہ دیا جائے؟ جو تحفہ مانگو گی ملے گا

میں نے چھیمی کی تصویر اخباروں میں دیکھی۔ بہت اچھی تھی۔ اگلے سال تم بھی کوئی انعام پاؤگی تب تم دونوں کے ہنس مکھ چہرے اخباروں میں چھپیں گے۔

تمہارے اور چھیمی کے لئے ایک لطیفہ لکھ رہا ہوں "جب حضرت نوح کی کشتی سے جانور اتر رہے تھے تو ہاتھی نے پسّو سے کہا جو ہاتھی کے پیچھے تھا "بھئی مجھے مت ڈھکیلو"

مغربی بنگال اردو اکاڈمی

۱۷، شندری موہن ایونیو کلکتہ۔ ۱۴

ted at :

ess, 8, Umadas Lane, Calcutta-16 Phone : 24-3640

rinted

Art Press